ماہنامہ

کراچی

آنکھ مچولی

فروری ۱۹۹۶ء

اس شمارے کے ساتھ

ورلڈ کپ شیڈول کارڈ

مفت حاصل کریں

LASER DOT
Transworld

FIRST-AID BANDAGE

SANIPLAST®

سنی پلاسٹ فوری امدادی پٹی

ہمیشہ اپنے پاس رکھیں

ہر زخم پٹی سنی پلاسٹ نہیں
دام دینے سے پہلے
نام ضرور دیکھ لیں۔

پیارے بچو! آپکو اسکول کے اوقات، کھیل کود اور دیگر مشاغل میں عموماً خراش، چھالے، چھوٹے زخم لگ جاتے ہیں۔ فوری امدادی پٹی سنی پلاسٹ استعمال کریں.... ہمیشہ سنی پلاسٹ کو اپنے اسکول بیگ، اسپورٹس کٹ، کتابوں کی الماری یا جیب میں دو ایک پٹیاں رکھیں تاکہ فوری ضرورت پر آپ SANIPLAST فوری امدادی پٹی استعمال کرسکیں۔

سنی پلاسٹ کا پیغام
صاف ستھرا ماحول صحت مند معاشرہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے

Marketed by:
uniferoz

UF/SP/MP-A/95

NATIONAL

ظلم اور دہشت کے خلاف ایک احتجاج

آنکھ مچولی کا

خصوصی شمارہ

مظلوم بچے نمبر

ایک خصوصی دستاویز

جون ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آرہا ہے

وہ پھول سے کومل بچے

جو گلی کوچوں میں بے گناہ قتل کر دیے گئے

اسکول جانے والے بچے

جو اسکول سے لوٹ کر گھر نہیں آئے

تاوان وصول کرنے کے لیے اغوا کیے جانے والے بچے

جن کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا

اور وہ تمام بچے

جو کسی نہ کسی ظلم اور دہشت کا شکار ہو گئے

ان بچوں کے بارے میں آنکھ مچولی میں

جیتے جاگتے فیچر، جیتی جاگتی تصویریں، المناک کہانیاں، اداس کر دینے والی نظمیں، مظلوم والدین کے انٹرویوز

آپ بھی لکھیے

اگر آپ کے شہر یا محلّے میں ایسے کسی بچّے کا اغوا یا قتل ہوا ہو تو معلومات جمع کیجیے اور مضمون یا فیچر تحریر کیجیے۔

یہ ایک قومی خدمت بھی ہوگی اور تحریر کا معاوضہ بھی ملے گا!

مضامین بھیجنے کا پتہ: مدیرِ اعزازی ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

رمضان/شوال ۱۴۱۶ھ/فروری ۱۹۹۶ء

شمارہ ۸

جلد ۱۰

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ
تجمل حسین چشتی

مدیر اعزازی
طاہر مسعود

مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

مینیجر اشتہارات
عمران احمد

مصور
مومن رحیم

فون نمبر : ۴۹۴۲۸۵۷ ۴۹۴۸۲۱۰

ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی

خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۰-اے، پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

قیمت : ۱۸ روپے
۷ درہم ۷ ریال

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاھد علی ۔ مطبع لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی

تحفہ وہ جو یاد رہے

تحفہ دینا اظہارِ الفت بھی ہے، باعثِ محبّت بھی اور نبیؐ کی سُنّت بھی

تحفہ

آپ کے خلوص کا اظہار اور آپ کے ذوق کا آئینہ دار ہوتا ہے

اپنے دوستوں اور پیاروں کو سالگرہ کا تحفہ دیجئے ۔ مگر ایسا جو سال بھر یاد رہے

آنکھ مچولی ایسا ہی تحفہ ہے

آپ ہمیں اپنے دوست کا نام، مکمل پتہ، سالگرہ کا دن اور 280 روپے کا منی آرڈر روانہ کیجئے ۔ ہم ایک خوب صورت برتھ ڈے کارڈ اور سال بھر کے لیے آنکھ مچولی آپ کے دوست کو بھجواتے رہیں گے ۔ ماہ بہ ماہ تازہ شمارہ آپ کے دوست کو آپ کی محبتوں کی یاد دلاتا رہے گا ۔

یاد رہے کہ آنکھ مچولی کے دس عام اور دو خاص شماروں کی سالانہ قیمت معہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ 444 روپے بنتی ہے ۔ مگر خصوصی تحفہ اسکیم کے لیے صرف 280 روپے

اِس رعایت سے آج ہی فائدہ اُٹھائیے

منی آرڈر فارم پر نام اور پتہ مفصل لکھئے ۔
مشرق وسطیٰ کے لیے 650 روپے
امریکہ اور یورپ کے لیے 830 روپے

سستا اور انوکھا سالگرہ کا تحفہ

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کیجئے

سرکولیشن منیجر : ماہنامہ آنکھ مچولی اے پی آئی بی کالونی کراچی

سنہرے حروف	ادارہ	۸
ماہِ رواں کی پہلی بات	اداریہ	۹
حمد باری تعالیٰ (نظم)	ضیغم حمیدی	۱۰
نعت رسولِ مقبولؐ (نظم)	تنویر پھول	۱۱
اپنی مٹی کا خیال	محمد جاوید خالد	۱۲
علم طب کا امام	محمد عظیم قریشی	۱۷
رنگ برنگ ابوقرن	فضل حق	۲۰
آسمان کو تکتی ہوئی آنکھیں	شگفتہ شمیم مصطفیٰ	۲۳
روزوں میں ہے رحمت سب کی (نظم)	آصف جاوید سکندر	۲۷
محاورہ کہانی	محمد عذیر مغل	۲۸
راج گڑھ کی حویلی	عبدالودود شاہ	۳۰
المکۃ المکرمہ (اسلامی شہروں کا تعارف)	الطاف حسین	۳۹
عیدالاضحیٰ کے برس آتی ہے چپکے چپکے (نظم)	افشاں بشیر	۴۲
وہ عید کب آئے گی	محمد عمر احمد خان	۴۴
عقل کے کرشمے	یاسر اعجاز	۴۸
ہنستے ہنستے (لطائف)	قارئین	۵۱
جیتے گا پھر پاکستان (نظم)	منور احمد صدیقی	۵۵
آخری کھلاڑی	محمد عمر احمد خان	۵۶
اور پاکستان جیت گیا	عائشہ محبوب	۶۲
سگریٹ نوشی کیسے شروع ہوئی	محمد عمر قریشی	۶۸
بنام آنکھ مچولی	قارئین کے خطوط	۷۰
ک سے کرسی	شبانہ رشید	۷۴
بکری اور مکڑی	افضال عاجز	۷۶
بیٹا	محمد بن مالک	۷۸
اوپن دی ڈور	اکمل شاکر	۸۳
ہوا یوں کہ...	قارئین	۸۷
وہ کون تھا	علی فرہاد حمید	۹۲
ایٹم کیا ہے؟	زوار حسین عجلانی	۹۸
ریپر سل	خالد یوسف انصاری	۱۰۱
قلم دوست	نئے ادیب	۱۰۷

سنہرے حروف

سلطان نصیر الدّین ہندوستان کا ایک نہایت مشہور بادشاہ گزرا ہے۔ وہ اپنی نیکی، خدا ترسی اور عبادت گزاری کی وجہ سے رعایا میں بہت مقبول تھا۔ ہمیشہ سادہ لباس پہنتا، دن اور رات کا زیادہ حصّہ عبادت میں گزارتا، اپنے ہاتھ سے قرآن مجید لکھا کرتا تھا اور قرآن کے ان نسخوں کی فروخت سے جو رقم ملتی تھی، اس سے گھر کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ اس معاملے میں وہ اتنا محتاط تھا کہ کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ قرآن مجید اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے تاکہ لوگ زیادہ ہدیہ دے کر نہ قرآن لینے لگیں۔ سلطان نصیر الدّین اتنا بااخلاق تھا کہ ایک روز سلطنت کا ایک امیر اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید دیکھ رہا تھا دیکھتے دیکھتے اس نے ایک لفظ پر انگلی رکھ کر سلطان سے کہا کہ "یہ لفظ آپ نے غلط لکھا ہے" سلطان نے اس کے گرد پینسل سے دائرہ کھینچ دیا لیکن جب وہ امیر چلا گیا تو سلطان نے دائرہ صاف کر دیا اور اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا۔ ایک مصاحب نے حیران ہو کر اس کا سبب دریافت کیا تو سلطان نے جواب دیا کہ "وہ لفظ میں نے ٹھیک لکھا تھا لیکن اپنے امیر کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

اسی سلطان نصیر الدّین کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن اس کی بیگم نے کہا "روٹیاں پکاتے پکاتے میری انگلیاں جل گئیں، اب کسی نوکرانی کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔" سلطان نے جواب دیا۔ "میری آمدنی اتنی نہیں ہے کہ میں کوئی نوکرانی رکھ سکوں۔ رہا سوال شاہی خزانے کا تو شاہی خزانہ میرا نہیں ہے میں تو محض اس کا رکھوالا ہوں۔"

ماہِ رواں کی پہلی بات

رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ ہر سال اپنے دامن میں رحمتیں، برکتیں اور بے شمار نعمتیں لے کر آتا ہے یہ مقدس مہینہ صبر، برداشت، دوسروں کی تکالیف محسوس کرنے، دوسروں کے کام آنے اور اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ کے ساتھ ساتھ بُری باتوں سے بچنے کا درس دیتا ہے۔

روزہ ارکانِ اسلام کا دوسرا رکن ہے اور ہر عاقل و بالغ مومن مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ پیارے نبی کریمؐ رمضان المبارک کا بڑے اشتیاق کے ساتھ انتظار فرماتے تھے۔ آپؐ جب رجب اور شعبان کا چاند دیکھتے تو دُعا فرماتے:

"اے ربّ العزّت! ہمیں رمضان المبارک تک پہنچا دے!" آپؐ کا ارشاد ہے:

"یہ مہینہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنّت ہے۔ یہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ اور دوزخ کی آگ سے نجات کا مہینہ ہے۔ اس مہینے ایمان والوں کی نیکیاں اور رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس کا پہلا حصّہ رحمت دوسرا (درمیانی) حصّہ مغفرت اور آخری حصّہ جہنم سے نجات کا باعث ہے۔ اس مبارک مہینے میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ پس جس نے روزہ رکھا ایمان اور احتساب کے ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے گئے۔"

پیارے نبی کریمؐ نے یہ بھی فرمایا کہ "روزہ ڈھال ہے شیطان کے وار سے بچنے کے لئے جب تک اسے پھاڑا نہ جائے۔" پوچھا گیا "کون سی چیز اسے پھاڑ دیتی ہے؟" آپؐ نے ارشاد فرمایا: "جھوٹ یا غیبت۔"

اس ماہِ مبارک میں ایمان و احتساب کے ساتھ روزے رکھیں اور جھوٹ و غیبت سے بچیں کہ جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے اور غیبت یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنے دوسرے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ جھوٹ اور غیبت اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔

اس بار آپ کی معلومات اور دلچسپی کے لئے رسالے میں کچھ نئی چیزیں شامل کی گئی ہیں جن میں اسلامی شہروں سے متعلق تعارف ..... اور صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ زندگیوں سے متعلق سوالات کا انعامی مقابلہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ ورلڈ کپ کے حوالے سے دلچسپ فیچر اور کہانیاں آپ کی تفریح کے لئے آپ کی منتظر ہیں۔ عنقریب ایک نیا دلچسپ اور منفرد ناول بھی قسط وار شروع کرنے کا ارادہ ہے۔

ماہِ مبارک کی سعادتیں سمیٹنے کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی اپنی دُعاؤں میں یاد رکھیں.... یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا اس بارے میں اپنی رائے اور مشوروں سے آگاہ کرنا نہ بھولئے گا۔

آپ کا دوست
مدیر آنکھ مچولی

اے مرے واحد خدائے پاک! اے مولا کریم
دو جہانوں کا تُو خالق اور ہے سب سے عظیم
ہر جگہ موجود ہیں تیری ہی قدرت کے نشاں
تو نے ہی پیدا کئے ہیں یہ زمین و آسماں
پھول، شبنم، باغ، کلیاں، بحروبر، شمس و قمر
ذکر کرتے ہیں ترا سب رات دن شام و سحر
تو ہی رازق، تو ہی آقا، تو ہی رحمٰن و رحیم
تو ہی داتا، تو ہی والی، تو ہی غفار و علیم
قادرِ مطلق ہے تو، کوئی نہیں تیرا شریک
میں تیرے در کا سوالی تو مجھے دیتا ہے بھیک
تو ہمیشہ سے ہے میرے دل کے کعبے میں مکیں
عقلِ انسان میں تری قدرت سما سکتی نہیں

نعت رسولِ مقبول ﷺ

(مدینہ منورہ سے واپسی پر)

الوداع اے بادشاہؐ انبیا!
جارہا ہوں پر یہیں ہے دل مرا
مختصر مدت گزاری ہے یہاں!
ہو قبول اے سرورِؐ کون و مکاں
اس تمنا میں ہے تڑپا دل مرا
دیکھ سکتا کاش جلوہ آپؐ کا!
خواب میں جلوہ مجھے دکھلایئے
حشر میں قدموں میں مجھ کو لایئے
یاد رکھئے حشر کے میدان میں!
جام کوثر کا عطا کیجئے ہمیں!
پھولؔ پر بہر خدا چشمِ کرم!
صاحب جوُدو کرم شاہِؐ امم!

اپنی مٹی کا خیال

محمد جاوید خالد

دو آنکھیں، دو کان، ایک ناک اور اس کے اوپر نیچے اپنی اپنی جگہ پر پیشانی اور ٹھوڑی بھی۔ جی ہاں وہ ایک انسان ہی تھا مگر بہت ہی عجیب و غریب، بہت ہی منفرد اور بہت ہی اہم۔ اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کی مخالفت ہو رہی تھی اور اب جب کہ وہ موجود تھا تو اسی پر اور اسی کی وجہ سے جھگڑا ہو رہا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ خود اپنی مخالفت سے، جھگڑے سے اور جھگڑے کے انجام سے بالکل بے خبر تھا۔

یہ شخص عجیب و غریب، منفرد اور اہم اس لئے تھا کہ کائنات کا سب سے پہلا انسان تھا۔ اس سے پہلے اس کی شکل و صورت، رنگ ڈھنگ اور طور طریقے کی کوئی مخلوق موجود نہ تھی۔ اسے مٹی سے بنایا گیا تھا۔ ایک مخلوق اور وہاں موجود تھی مگر وہ نوری تھی، نور سے بنی ہوئی۔ البتہ ایک وجود وہاں ایسا بھی تھا جو نہ مٹی سے بنا تھا اور نہ

نور سے بلکہ اس کی تخلیق آگ سے ہوئی تھی۔ مٹی سے بننے والے انسان آپ سمجھ گئے ہوں گے، آدمؑ تھے، نوری مخلوق فرشتے، اور آگ سے زندگی پانے والے شیطان۔ سامنے ہی تخت جلال و جبروت پر جلوہ فرما تھے اللہ تعالیٰ۔

یہ کائنات کب سے ہے؟ کوئی نہیں جانتا ماہ و سال کے پیمانے کبھی کے ختم ہو چکے اب تو نوری سال کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے مگر اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ اس طرح سے ایک مخلوق بنائی جائے اور نام آدمؑ رکھا جائے پھر اس آدمؑ سے بہت سے آدمی زمین پر پھیلا دئے جائیں اس نے جیسا چاہا کیا مگر یہ بات پہلے آدمی کے پہلے دن کی ہے۔ اس پہلے آدمی کے وجود میں لانے سے پہلے جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مخلوق زمین پر اللہ کی ٹھیک ٹھیک نائب کیسے ثابت ہو سکے گی۔ جب کہ شر اور فساد سے کام لے گی۔ اس کی بجائے شاید وہ یہ سوچ رہے تھے کہ نائب ہونے کا ٹھیک ٹھیک کام تو وہ خود کر سکتے ہیں۔ خیر انہوں نے مخالفت کی لیکن مخاصمت نہیں کی۔ مخاصمت کا مطلب ہے لڑائی جھگڑا۔ یہ کام آگ سے بنے ہوئے شیطان نے کیا۔

ہوا یہ کہ جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے پہلے آدمی یعنی آدمؑ کو بنایا تو فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کی تعظیم کرو، اسے سجدہ کرو۔ وہ حکم کے بندے آناً فاناً سجدے میں گر گئے۔ یہی حکم شیطان کو ملا تو وہ اکڑ گیا۔ کہنے لگا کہ میں آگ سے بنا ہوں جو نیچے سے بلندی کی طرف اٹھتی ہے۔ یہ مٹی سے بنا ہے جو پستی کی جگہ ہے۔ میں بڑا، یہ چھوٹا۔ میرا مقام بلند اس کا درجہ کم میں اسے سجدہ کیوں کروں؟ کم بخت نے یہ تو دیکھ لیا کیا کہا جا رہا ہے یہ نہ سوچا کہ کس نے کہا ہے؟ گویا آدمؑ کو سجدہ نہ کیا، چلو نہ کیا مگر نافرمانی ہو گئی اللہ تعالیٰ کی جو ساری کائنات کا خالق بھی، مالک بھی اور اسے پالنے والا بھی۔ ظاہر ہے کہ اس اکڑفوں کا انجام یہی ہونا تھا کہ ذلیل ہو کر اللہ تعالیٰ کے دربار سے نکال دیا گیا لیکن نکلا تو آدمؑ کے لئے سخت کینہ اور حسد دل میں لے کر نکلا اور خود اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر اس نے قسم کھائی۔ قسم بھی کس کی کھائی اللہ تعالیٰ کی عزت کی۔ کہنے لگا "پروردگار تیری عزت کی قسم میں اسے یعنی آدمؑ کو اور اس کی اولاد کو بہکاؤں گا، خراب کردوں گا اور ان سے تیری دوزخ کو بھردوں گا۔"

وہ دن ہے اور آج کا دن شیطان اپنی قسم کو نبھا رہا ہے اور اپنے داؤ آزما رہا ہے۔ نت نئے ہتھیار اس کے پاس ہیں اور ان ہتھیاروں سے اولاد آدمؑ کو گمراہ کرتا ہے، خراب کرتا ہے۔ اللہ

تعالیٰ نے بھی اس کا چیلنج قبول کرتے ہوئے اسے چھوٹ دے دی لیکن اپنے بندوں کے لئے اس کے مکر و فریب سے پر ہتھیاروں سے بچنے کا انتظام کردیا۔ یہ انتظام اس کے سچے پیغمبر تھے جنہیں وہ مختلف علاقوں اور مختلف وقتوں میں دنیا والوں کی ہدایت کے لئے بھیجتا رہا یہاں تک کہ ساری دنیا کے لئے اس نے اپنی ہمیشہ رہنے والی تعلیم اپنے سب سے برگزیدہ پیغمبر جناب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیج دی۔ یہ تعلیم اپنے اندر ایسا نظم و ضبط اور ایسا ڈسپلن رکھتی ہے کہ اس کو اختیار کرنے والے پر شیطان تاؤ تو کھا سکتا ہے، جھنجلا بھی سکتا ہے مگر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تعلیم گویا کہ ایک نصاب ہے۔ اس نصاب کے مختلف موضوعات (Subjects) ہیں اور ان ہی میں سے ایک روزہ ہے۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روزہ کیا ہے؟ روزہ بظاہر تو ایک خاص وقت پر کھانا پینا بند کر کے تمام دن بھوکا پیاسا رہنے کا نام ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو رمضان کے ۳۰ دن یعنی ۷۲۰ گھنٹے کے ایک مضبوط ڈسپلن، قاعدے، ترتیب کا نام ہے۔ جو چیز ایک منٹ پہلے حلال ہے مثلاً کھانا پینا، روزہ رکھتے ہی حرام ہوگئی اور جو چیز تمام دن حرام ہے روزہ کھولتے ہی حلال ہوگئی۔ یہ مشق مسلسل ایک مہینہ تک ہوتی ہے۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کیوں؟ اور اس کیوں کے جواب کے لئے آپ کو ذہن کے پردے پر وہی پہلے آدمی، اپنے ابا جان یعنی حضرت آدمؑ کا پہلا دن لانا ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ آگ سے پیدا شیطان کے چیلنج کو دل کے کانوں سے سننا ہوگا اور اب آیئے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک پر غور کیجئے جسے روایت کیا ہے حضرت عثمان بن ابو العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے۔ آپؐ نے فرمایا۔ "جس طرح لڑائی میں تمہارے پاس ڈھال ہوتی ہے جو دشمن کے حملوں سے تمہیں بچاتی ہے اسی طرح یہ روزہ تمہارے لئے ڈھال ہے، جو جہنم سے بچانے والی ہے۔"

معلوم ہوا کہ روزہ ڈھال ہے شیطان کے وار اور جہنم کے عذاب سے بچانے کے لئے۔ گویا بظاہر تو انسان بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مسلمان تمام دن کھانے پینے سے رک جاتا ہے۔ لیکن دراصل وہ شیطان کا مقابلہ بھرپور دفاع سے کرتے ہوئے خود کو مسلح بھی کرتا ہے پورے تیس دن تک مقابلہ کر کے خود کو ناقابل تسخیر ثابت کرنے والا مردِ مسلمان اس عرصے میں اتنا مسلح بھی ہو جاتا ہے کہ خود بڑھ کر اپنے ازلی دشمن یعنی شیطان پر وار کر سکتا ہے۔ اب آخر میں آیئے یہ دیکھتے ہیں کہ ایسا کیسے ہوتا ہے؟ ایسا اس طرح ہوتا ہے کہ شیطان کے سامنے خود کو بے بس کرتے کرتے

انسان کا نفس اتنا کمزور ہوجاتا ہے کہ وہ یعنی شیطان اس پر مکمل قابو پالیتا ہے اور جیسا چاہے استعمال کرتا ہے۔ جو چاہے اور جب چاہے آپ کو کھلائے پلائے آپ کے ہاتھ پاؤں' زبان' کان' آنکھیں جن سے جیسا چاہے ویسا کام لیتا ہے۔ ایسے میں روزہ آجاتا ہے۔ روزہ کیا آجاتا ہے گویا اللہ تعالیٰ کی مدد آجاتی ہے۔ اب نفس نے شیطان کے اصرار پر کھانے کو مانگا' پینے کو مانگا' جھوٹ بولنے کی ترغیب دی' غیبت پر اکسایا' فساد پر آمادہ کیا' پھر بد زبانی کی دعوت دی' بری جگہ پر لے جانا چاہا لیکن اس سب کے جواب میں دل سے ایک آواز اٹھی "میں روزے سے ہوں" اور یہ سارے شیطان کے ہتھیار آپ کے روزے کی ڈھال کے آگے بے بس ہوگئے۔ گویا قدرت نے نفس کے سرکش گھوڑے کو لگام ڈال دی اور وہ لگام آپ کے ہاتھ میں دے کر آپ کو مضبوط کردیا۔

اس بات کی تصدیق حضرت ابو ہریرہؓ کی بیان کردہ ایک روایت سے ہوتی ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "صرف کھانا پانی چھوڑ دینے کا نام روزہ نہیں ہے' اصلی روزہ تو یہ ہے کہ آدمی بے ہودہ اور بے کار باتوں سے بچے' اس لئے روزہ دار اگر مجھے گالی دے یا جہالت پر اتر آئے تو تو کہہ میں روزے سے ہوں' میں روزے سے ہوں۔"

آپؐ کے ایک اور ارشاد کا مطلب ہے "جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ "کتنے ہی روزہ دار ہیں کہ روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" پیارے نبیؐ کے یہ تمام پیارے ارشادات کیا یہی تمہیں بتارہے ہیں کہ روزہ بھوکا پیاسا رہنے سے آگے بڑھ کر ایک کیفیت کا نام ہے اور وہ کیفیت ہے تقویٰ۔ کلام خدا کے پہلے پارہ کی دوسری سورت کی ایک آیت میں روزے کا مقصد اللہ تعالیٰ نے بھی یہی قرار دیا ہے یعنی تقویٰ۔ تقویٰ کیا ہے؟ تقویٰ بھی ایک ڈھال ہے۔ فرق یہ ہے کہ روزہ ایک مہینے کی ڈھال ہے اور تقویٰ سارا سال کی۔ تقویٰ نام ہے اس احساس کا کہ آپ اللہ کے بندے ہیں' زمین پر اس کے نائب ہیں آپ کو اس کا نام سربلند کرنا ہے اور شیطان کو شکست دینا ہے اور اس معرکے میں آپ کے پاس خدا کے عطا کردہ بہت سے ہتھیار ہیں جن میں ایک رمضان المبارک بھی ہے۔

ذرا اندازہ لگائیے ساری زندگی نوافل پڑھتے رہئے فرض کے برابر نہیں ہوتے رمضان میں نفل کا درجہ فرض کے برابر ہوجاتا ہے۔ ایک

رات کی عبادت ایک ہزار مہینوں یعنی تراسی سال سے بھی زیادہ افضل ہے اور آپ کے روزہ رکھنے کا اجر خود اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ لینا فرماتا ہے۔ قدرت آپ پر کس قدر مہربان ہے؟ اور شیطان کی کمر توڑنے کے لئے کیسی زبردست ڈھال آپ کے پاس ہے۔

اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے کہ ہمارے اردگرد کے ماحول میں رمضان المبارک کے آتے ہی کیسی تبدیلی آجاتی ہے۔ مسجدیں آباد، گھروں سے تلاوت قرآن کی آوازیں، نیکی و ہمدردی کے جذبے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کہیں کہیں شر اور شیطان کی قوت میں بھی زبردست اضافہ محسوس ہوتا ہے حالانکہ شیطان اس مہینے میں ویسے ہی قید کردیا جاتا ہے۔ اس کے جواب کے لئے ایک چھوٹی سی مثال پر غور کیجئے۔ آسمان سے صاف و شفاف پانی کے قطروں کی بارش ہوتی ہے۔ یہ ستھرا پانی چمن پر گر کر پھولوں کے کھلنے اور خوشبو کے مہکنے کا سبب بنتا ہے۔ مگر یہی پانی کسی بدبو کے ڈھیر پر گر کر گندگی اور بدبو کو پھیلانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ گویا بات پانی کی نہیں بات اس زمین کی ہے، اس مٹی کی ہے جس پر وہ گرتا ہے۔ رمضان المبارک کا بھی یہی حال ہے خدا کی رحمتیں قطار اندر قطار مسلسل دنیا والوں کی طرف آتی ہیں بس ہمیں اپنی زمین، اپنی مٹی کا خیال رکھنا ہے۔

آنکھ مچولی

آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے مشوروں کی روشنی میں بہتر سے بہتر رسالہ ترتیب دیں اور بروقت آپ تک پہنچائیں۔
ہماری کاوش آپ تک اور
آپ کی رائے ہم تک پہنچانے میں

ہمارے مُعاون

ہمارے مَددگار

صُوبہ سندھ اور بلوچستان میں آنکھ مچولی کے ایجنٹ

محمد حسین برادرز — کراچی — ۷۷۲۳۱۲۶
مہران نیوز ایجنسی — حیدرآباد — ۲۰۱۲۸
سلمان برادرز — نواب شاہ — ۲۳۱۴
ایم ایم ٹریڈرز — کوئٹہ — ۷۵۰۰۲

خط و کتابت کے لیے

سرکولیشن مینیجر
ماہنامہ آنکھ مچولی۔ ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

علمِ طب کا امام

محمد عظیم قریشی

دنیا کی تاریخ میں جہاں بہت سے طبیبو ں کا نام آتا ہے وہاں "محمد بن زکریا رازی" کا نام علم طب کے امام کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔ رازی ۸۶۰ء میں ایران کے قدیم شہر "رے" میں پیدا ہوئے جو مشہور شہر تہران سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ ابتدا میں طبیعت تعلیم کی بجائے گانے بجانے کی طرف مائل تھی۔ لیکن جب زندگی کی ذمہ داریاں بڑھیں تو کیمیا گری کے فن کو اپنالیا۔ ان کا خیال تھا کہ کیمیا گری کی بدولت وہ کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرکے بہت جلد امیر اور دولت مند بن جائیں گے۔ کیمیا گری کے جو طریقے اس زمانے میں مشہور تھے، ان میں مختلف جڑی بوٹیوں کو ملا کر دنوں بلکہ مہینوں تک آگ پر رکھنا پڑتا تھا۔ زکریا رازی نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے حصول کے لئے انہیں دوا فروشوں کی دکانوں پر جانا پڑتا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی ایک دوا فروش سے دوستی ہوگئی۔ چنانچہ وہ فرصت کے لمحات میں

☆ فرض ایک ایسا قرض ہے جس کو سوائے اپنے کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا۔

☆ محنت اور کام کی لگن انسان کو بوریت و بداخلاقی اور ملک کو بدحالی سے محفوظ رکھتی ہے۔

☆ جو شخص ایک مدرسہ قائم کرتا ہے دراصل وہ ایک جیل بند کرتا ہے۔

مرسلہ : شاہد الرحمن چوہدری، سرگودھا

عموماً" اس کی دکان پر بیٹھ جاتے۔ اس سے ان میں رفتہ رفتہ طب کے علم میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ایک دن کیمیاگری کے شوق میں آگ کو پھونکیں مارتے مارتے ان کی آنکھیں جھلس گئیں۔ وہ علاج کے لئے ایک طبیب کے پاس گئے۔ طبیب نے علاج کرنے کے لئے اچھی خاصی فیس طلب کی۔ اب رازی کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اصل کیمیاگری تو یہ ہے نہ کہ وہ جس میں وہ سر کھپاتے رہے چنانچہ اب رازی نے اپنی توجہ علم طب پڑھنے میں صرف کی اور بڑی محنت سے اس میں کمال حاصل کیا، چند ہی سالوں میں ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ وہ "رے" کے سرکاری شفاخانے کے افسر اعلیٰ بنائے گئے۔ وہ بڑی توجہ سے مریضوں کے حالات سنتے اور نہایت غور و فکر سے ان کے لئے نسخے لکھتے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تجویز کردہ دواؤں کے اثرات کا مطالعہ کرتے۔ یہ تمام تجربے وہ اپنی بیاض میں جمع کرتے جاتے۔ انہی یاد داشتوں کو انہوں نے بعد میں کتابی شکل میں مرتب کیا۔

رازی نے علم طب پر اپنی پہلی تصنیف کا نام والیٔ رے "منصور بن اسحاق" کے نام پر "منصوری" رکھا۔ اس تصنیف سے رازی کا نام پوری عباسی سلطنت میں مشہور ہوگیا۔ ۹۰۸ء میں بغداد کے مرکزی شفا خانے میں، جو اس زمانے میں عالم اسلام کا سب سے بڑا شفا خانہ تھا، انہیں اعلیٰ افسر کا عہدہ پیش کیا گیا جہاں وہ چودہ برس تک رہے۔ یہ عرصہ انہوں نے طبی تحقیقات اور تصنیف و تالیف میں گزارا۔

ان کی سب سے مشہور کتاب "حاوی" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اگرچہ وہ اپنی زندگی میں کبھی سونا بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے تاہم انہوں نے کیمیاگری کے فن پر جو کچھ لکھا اسے آج بھی مستند سمجھا جاتا ہے۔ رازی نے اپنی زندگی کے دس بارہ برس اپنے آبائی گاؤں "رے" میں گزارے آنکھیں جھلسنے کے واقعہ کے بعد ان کی بینائی روز بروز کم ہونے لگی اور آخر کار وہ بالکل نابینا ہوگئے۔ بڑھاپا اور اس پر اندھاپن، غرضیکہ محمد بن زکریا رازی کی آخری عمر بڑی مصیبت میں گزری اور فن طب کا یہ امام ۹۳۲ء میں ۹۲ سال کی عمر پانے کے بعد انتقال کر گیا۔

درخت

ضیاالحسن ضیا

یہ بھی سوچا ہے دوستو تم نے
فائدے کتنے ہیں درختوں سے
ان کے سائے میں لوگ سوتے ہیں
ان کو اپنے گھروں میں بوتے ہیں
پیڑ ہیں یہ زمین کا زیور
ساری مخلوق کے لئے بہتر
ان کا نظارہ دل لبھاتا ہے
دیدہ و دل کو جو سجاتا ہے
نیم، شہتوت، آم اور چنار
ہیں گھنے اور کتنے سایہ دار
ان کے دم سے ہے جنگلات کی شان
ان سے بنتا ہے کھیل کا سامان
یہ نہ ہوتے تو کس طرح بنتے
کرسیاں، میز، اور دروازے
ان درختوں نے ہی ہمیں بخشے
پھل مزے دار اور یہ میوے
چھال کیکر کی رنگ لاتی ہے
چمڑا رنگنے کے کام آتی ہے
اور دوائیں بھی ان سے بنتی ہیں
کوئی جاتی ہیں اور چھنتی ہیں
ان کی مل کر کریں حفاظت ہم
انکی خدمت سے پائیں دولت ہم

جنگل کی دنیا

رنگ برنگ

"ابوقرن"

برازیل کا کھلنڈرا پرندہ

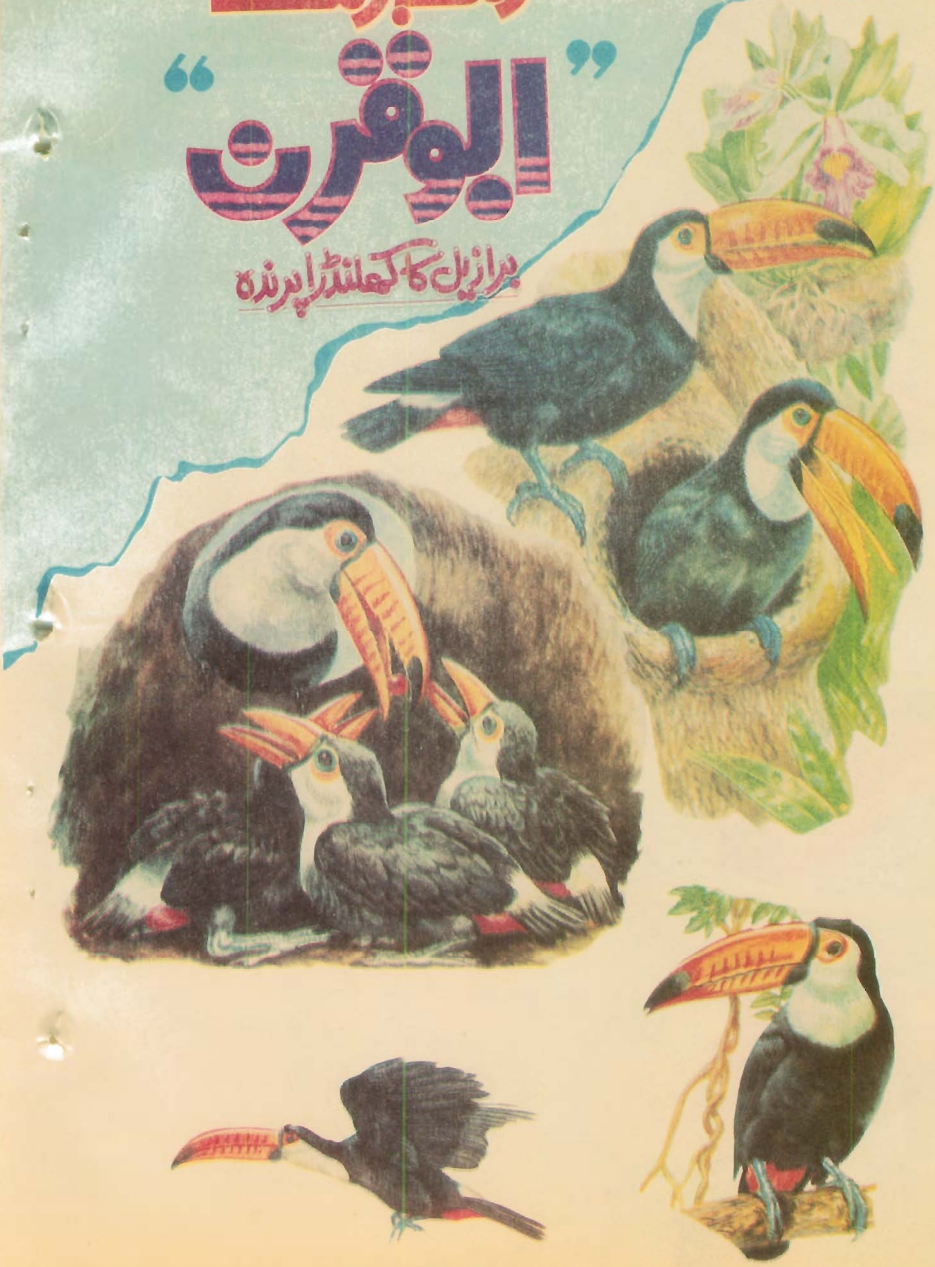

ٹوکو شور بہت مچاتے ہیں!

ٹوکو کو اُردو میں ابو قرن کہتے ہیں۔ اس بھاری بھرکم پرندے کی چمکدار زرد رنگ کی چونچ بے حد لمبی ہوتی ہے۔یہ اپنی نسل میں سب سے بڑا پرندہ ہےاور اونچے درختوں پر بسیرا کرتا ہے یہ منطقہ حارہ کے برازیلی (جنوبی امریکہ کے) جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔

ٹوکو بڑے شور مچانے والے پرندے ہیں۔ ایک دوسرے کو چیخ وپکار سے بُلاتے ہیں۔ یہ چونچ کو درختوں سے ٹکرا کر پُرشور ماحول بنائے رکھتے ہیں۔ ٹوکو بہت دوست بنانے والے خوش باش پرندے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کی آؤ بھگت میں خوراک پیش کرتے ہیں۔ یہ درختوں پر قدرے فاصلے پر بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے سے چونچ کے سرے سے گفتگو کرتے ہیں۔

یہ زیادہ تر پھل کھاتا ہے!

ٹوکو زیادہ تر پھل کھاتے ہیں۔ درخت کی مضبوط شاخوں پر بیٹھ کر اپنی لمبی چونچ سے نازک ڈالی سے پھل کھینچ لیتے ہیں اور خوراک اور پھل اپنی چونچ سے پکڑ کر سراوپر اُٹھا کر حلق میں اُنڈیل لیتے ہیں ان کی زرد نارنگی رنگ کی بڑی چونچ کے کنارے پر آرے جیسے دندانے ہوتے ہیں۔ چونچ چونکہ کھوکھلی ہوتی ہے اس لئے بہت ہلکی ہوتی ہے۔

اونچائی پر بسیرا!

ٹوکو درختوں کی اونچائی پر تنوں کے سوراخوں میں گھونسلہ بناتے ہیں۔ لیکن اگر زمین کے قریب بھی درخت کے تنے میں اچھا سوراخ مل جائے تو اسے بھی گھونسلے کے لئے استعمال کرلیتے ہیں۔ مادہ ٹوکو نرم وگداز گھونسلہ پسند نہیں کرتی۔ کھُردرے گھونسلے میں ہی دو سے چار انڈے دے دیتی ہے۔ دونوں میاں بیوی انڈے سیتے ہیں' لیکن یہ پرندے فطرتاً" جلد باز اور بے صبرے واقع ہوئے ہیں۔ بسا اوقات دونوں میاں بیوی انڈے اور گھونسلہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

ان کے بچّوں کی نشوونما سست ہوتی ہے!

سولہ دن بعد بچے نکلتے ہیں جو اندھے اور گنجے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی چونچیں بہت چھوٹی اور ٹخنوں کے گرد گچھے دار تلوے ہوتے ہیں۔ جو ان کو کھُردرے گھونسلے میں آرام سے رہنے میں مدد دیتے ہیں۔ ماں باپ بچّوں کو پھل کھلاتے ہیں مگر بچّوں کی نشوونما بے حد سست رفتار ہوتی ہے۔ ایک ماہ سے پہلے ان کے پر نہیں اُگتے چنانچہ تقریباً" پچاس دن تک گھونسلے میں رہتے

ہیں۔

یہ پرندے لمبی اُڑان نہیں اڑتے۔ عموماً" ایک درخت کی چوٹی سے دوسرے درخت کی چوٹی تک اُڑان مار لیتے ہیں۔ چند لمحے پرندوں کے پنکھے چلاتے ہیں پھر بند کر کے بلندی سے نیچے آجاتے ہیں۔ ان کی زبانیں پر جیسی ہوتی ہیں جو ۱۵ سینٹی میٹر لمبی ہوتی ہیں۔

جنگل کے کھلنڈرے!

ٹوکو کھیل کود کے شوقین پرندے ہیں اور آپس میں کھیل تماشے سے خوب محظوظ ہوتے ہیں۔ یہ آپس میں چونچیں لڑاتے ہیں۔ چونچ سے ایک دوسرے کو دھکیلتے ہیں یہاں تک کہ کمزور ٹہنی سے نیچے گر جاتا ہے لیکن پھر دوبارہ مقابلے پر جم جاتا ہے۔

پھلوں کے ٹکڑے اُچھال کر پکڑنا بھی ان کا ایک دلچسپ کھیل ہے۔

برازیل کا یہ بھاری بھر کم پرندہ رنگوں کے لحاظ سے ہی شوخ نہیں بلکہ شوخی و شرارت میں بھی لاجواب ہے!!

آنکھ مچولی آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے مشوروں کی روشنی میں بہتر سے بہتر رسالہ ترتیب دیں اور بروقت آپ تک پہنچائیں۔ ہماری کاوش آپ تک اور آپ کی رائے ہم تک پہنچانے میں

ہمارے معاون ہمارے مددگار

صوبہ سرحد و پنجاب میں "آنکھ مچولی" کے ایجنٹ

۱۔ افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
۲۔ سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
۳۔ راولپنڈی نیوز ایجنسی	راولپنڈی	۵۵۵۶۱۹
۴۔ اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰
۵۔ فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
۶۔ اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
۷۔ سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
۸۔ پاکستان اسٹنڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
۹۔ خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
۱۰۔ طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
۱۱۔ چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۲۶۲۶
۱۲۔ مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
۱۳۔ رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
۱۴۔ رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاولنگر	
۱۵۔ ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
۱۶۔ سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
۱۷۔ اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹
۱۸۔ کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷

خط و کتابت کے لیے سرکولیشن مینجر" ماہنامہ آنکھ مچولی، اے پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

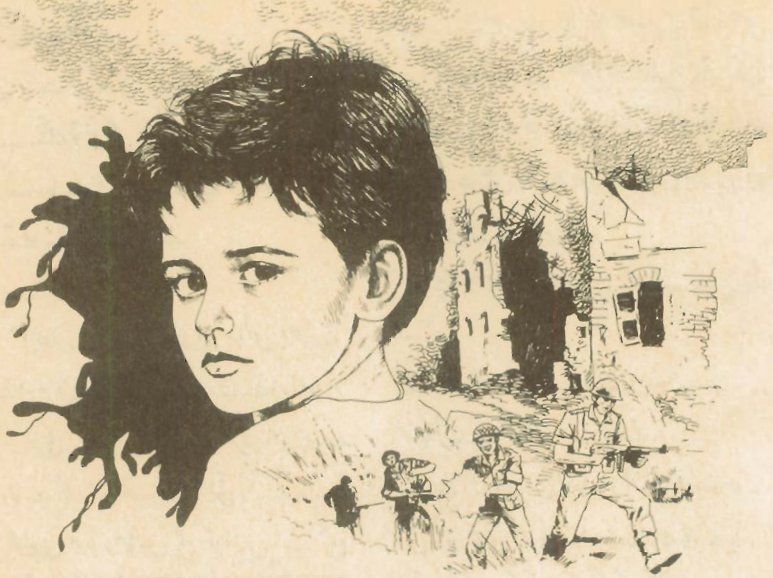

لہولہان بوسنیا ہرزو گوینا کے پس منظر میں
لکھی گئی ایک غم ناک کہانی

آسمان کو تکتی آنکھیں

شگفتہ شمیم مصطفیٰ

حارث کمرے کے گھپ اندھیرے ماحول میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ ہر طرف ایسی خاموشی طاری تھی جیسے وہاں بلاؤں کا قبضہ ہو۔ کہیں دور سے وقفے وقفے سے دھماکوں اور گولیوں کی آوازیں آتیں اور پھر پہلے جیسی خاموشی چھاجاتی۔ وہ اپنے پلنگ پر کروٹیں لینے لگا۔

"اماں.....!" اس نے تھوڑی دیر بعد اکتا کر ماں کو پکارا۔

"اماں.....!" جواب نہ ملنے پر اور زیادہ زور سے آواز دی۔

"کیا ہوا....." ماں کی گھبرائی سی آواز کمرے کی تاریکی میں گونجی۔

"اماں۔ بتی جلادو۔"

"بتی کہاں ہے بیٹا۔" ماں کے لہجے میں حسرت تھی۔ "ابھی تو رات بھی نہیں ہوئی.....

تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ پھر موم بتی جلادوں گی۔"
ماں تسلی دینے لگی۔
"اتنی رات تو ہوگئی ہے۔ دیکھو کتنا اندھیرا ہے..... مجھے تو تم بھی نظر نہیں آرہیں ماں....."
"ڈر لگ رہا ہے؟" اس کے لہجے کا خوف محسوس کرتے ہوئے ماں نے پوچھا۔
"ہاں...."
"اچھا ....." ماں ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے موم بتی لینے چلی گئی۔ حارث نے ذرا سا سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ہر طرف اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا۔ دور لڑائی والے علاقے سے گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ دھماکے کے ساتھ ہی ایک تیز روشنی پل بھر میں آسمان پر چھا کر معدوم ہوجاتی تھی۔ ایسے میں حارث کو ایسا لگتا جیسے آسمان پر ان تمام معصوم اور بے گناہ مسلمانوں کا خون بکھر گیا ہو جو ایک عرصے سے جاری رہنے والی لڑائی میں جی رہے ہیں۔
بوسنیا کے چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والا حارث اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی بڑی باتیں سوچتا تھا۔ اس کے بابا کا نام احمد علی تھا۔ احمد علی کا شمار گاؤں کے بڑے زمین داروں میں ہوتا تھا۔ جب جنگ نہیں شروع ہوئی تھی اور بوسنیا میں ہر طرف امن ہی امن تھا تو احمد علی حارث کو اپنے کاندھے پر بٹھا کر کھیتوں کی سیر کراتا تھا۔ اس وقت حارث تین چار سال کا معصوم بچہ تھا مگر اس سے اپنی زمینوں کے متعلق اس طرح باتیں کرتا تھا جیسے وہ بڑی عمر کا سمجھدار لڑکا ہو۔ احمد علی اسے اپنے کھیت میں اگائے ہوئے فصلوں اور پودوں کے متعلق بتاتا اور پھر کہتا۔
"میرا بیٹا بڑا ہو کر زراعت پڑھے گا..... کیا پڑھے گا۔"
"جراعت" حارث توتلے لہجے میں جواب دیتا۔
"شاباش....." بابا خوش ہوجاتے۔
حارث کو وہ دن بہت یاد آتے تھے۔ وہ لوگ کتنی ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے پھر نہ جانے ان کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی۔ جب بوسنیا کے آسمان پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے اور دیکھتے دیکھتے بہت سے علاقے جنگ کی لپیٹ میں آگئے۔ بوسنیا کے پڑوسی ملک سربیا نے بڑی چالاکی اور مکاری کے ساتھ رات کی تاریکی میں حملہ کر کے بہت سے علاقوں کو قبضے میں لے لیا تھا۔ لوگ دشمن کی اس بزدلانہ کاروائی پر طیش میں آگئے اور فوجی جوانوں کے ساتھ ساتھ عام شہری بھی ملک و قوم کی دفاع کی خاطر جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسے میں گاؤں کے زمین دار اور کسان کہاں پیچھے رہتے۔ وہ بھی فوجی جوانوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لئے تربیتی اداروں میں

جنگ کی مشق کرتے اور گھر بار کو خدا کے حوالے کر کے جہاد کے لئے نکل پڑتے۔

حارث کے بابا بھی ان جہاد کرنے والوں میں شامل تھے۔ ان کے دل میں اپنی زمین اور دھرتی کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بابا دن بھر کھیتی باڑی کے کام کی دیکھ بھال کرتے اور شام کو جہاد کے لئے نکل جاتے تھے۔

حارث سوچ رہا تھا کہ پہلے تو بابا روز صبح گھر آجاتے تھے مگر اب ہفتوں بابا کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔

"اللہ میاں..... جنگ جلدی سے ختم ہوجائے تاکہ بابا ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں اور کبھی چھوڑ کر نہ جائیں۔" کھانے کے بعد حارث سونے کے لئے لیٹا تو حسب معمول یہ دعا دہرانے لگا۔

صبح حارث کی آنکھ کھلی تو سورج طلوع ہوچکا تھا مگر فضا میں پہلے جیسی چہل پہل اور پرندوں کی چہچہاہٹ کی آوازیں نہ تھیں بلکہ سناٹا اور بھی گہرا تھا۔ کیونکہ اب گولیوں اور بموں کے دھماکوں کی آوازیں نہیں آرہی تھیں۔ شاید لڑائی میں وقفہ ہوگیا تھا۔

"ہوسکتا ہے جنگ ہوگئی ہو۔" وہ سوچنے لگا۔

"حارث بیٹے....." ماں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی

"جی اماں۔"

"بیٹا..... تمہارے بابا تو آج بھی نہیں آئے....."

"تو ....." وہ سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

"بیٹا..... پانی ختم ہوگیا ہے..... میں سوچ رہی ہوں خود ہی جاکر لے آؤں۔"

میں بھی چلوں....." وہ فوراً بولا۔

"نہیں..... تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں اماں..... میں بالکل ٹھیک ہوں..... میں آپ کے ساتھ چلوں گا تو ہم گھر کے لئے زیادہ پانی لاسکیں گے۔"

"اچھا....." وہ بیٹے کی ضد کے آگے مجبور ہوگئی۔

حارث ماں کا ہاتھ تھامے محلے کی سنسان گلیوں سے ڈرتے ہوئے بہت خوف محسوس کررہا تھا۔ ہر طرف مکانات اور دوکانیں جنگ سے ہونے والی تباہی کا نقشہ پیش کررہے تھے۔ ملبوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی کثیف بدبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ریڈ کراس والوں کی طرف سے لگائے ہوئے پانی کے مصنوعی نلکے پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ماں پانی کے برتنوں کی لمبی قطار کے پیچھے اپنا برتن رکھ کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ جس جس کا برتن پانی سے بھر جاتا وہ اسے اٹھاتا اور گلیوں میں گم ہوجاتا۔ یوں لگتا تھا جیسے لوگ اپنے گھروں سے باہر صرف اسی مقصد کے لئے آئے ہوں۔

اقوال زریں

- انسان کی بہترین رفیق اور مونس کتابیں ہیں۔
- وہ شخص سب سے بہترین زندگی بسر کرتا ہے جو اپنی ضروریات کے لئے کسی غیر پر بھروسہ نہیں رکھتا۔
- سب سے بڑی خیانت قوم کے سامنے غداری ہے۔
- عمل کی قوت یہ ہے کہ آج کے کام کو کل پر نہ اٹھا رکھا جائے۔

مرسلہ : زریاب حسین، کراچی

جنگ نے لوگوں کو اس قدر خوفزدہ کردیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ ہر کوئی سہما سا اپنی جگہ کھڑا تھا۔ ہجوم آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا۔ اب صرف چند لوگ ہی وہاں پر باقی رہ گئے تھے۔

پیاز لے لو... مٹر لے لو۔" سبزی والے نے آواز لگائی تو حارث کی ماں اپنی فراک کی جیبیں ٹٹولنے لگی۔

"حارث تم یہاں رکنا میں ذرا سبزی لے لوں۔" وہ اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ دور اقوام متحدہ کی ایمبولینس کھڑی تھی جس میں کارکن کسی شخص کی لاش ڈال رہے تھے۔

"پتہ نہیں.... یہ کون ہوگا.... ہوسکتا ہے میں اسے جانتا ہوں۔"

"ائے.....!" کسی نے اس کے کاندھے جھنجھوڑے۔ "تمہاری باری آگئی ہے۔"

"اچھا۔" حارث نے جھک کر خالی بالٹی اٹھانی چاہی۔ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ حارث کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے جسم میں چنگاری بھردی ہو۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا ہو۔

"اماں....!" اس نے درد سے کراہتے ہوئے زور سے ماں کو پکارا۔ پھر اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

گرمی اور سورج کی تپش میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوگیا تھا مگر سنسان سڑک پر بیٹھی ہوئی عورت کو اس تپش کا احساس نہیں تھا۔ وہ صدمے سے گنگ معصوم بیٹے کی لاش کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ ریڈ کراس کی ایمبولینس آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی اس کے قریب آئی اور ایک کارکن نے آگے بڑھ کر مُردہ بیٹے کی لاش کو ماں کی گود سے الگ کردیا۔ جب وہ بچے کو اٹھائے ایمبولینس کی طرف جارہا تھا تو اس کی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

روزوں میں ہے رحمت رب کی

آصف جاوید سکندر

بات ضروری سُن لو آؤ پیارے بچو گر تم چاہو
عید کی خوشیوں پر حق اپنا تو پھر روزے سارے رکھنا
بچّوں میں سے ہمّت کر کے جو رکھے گا سارے روزے
تو پھر ہوگی عید اُسی کی دن بھی خوشی کا شام خوشی کی
سحری میں ہے برکت رب کی روزوں میں ہے رحمت رب کی
اس رحمت سے دامن بھر لو اپنے رب کو راضی کرلو

محاورہ کہانی

محمد عزیز مغل

آج کل ہمارے اسکول میں موسم سرما کی تعطیلات ہیں اس لئے "راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔" "ہاتھ پہ ہاتھ دھرے" بیٹھے رہنا ہماری عادت نہیں اس لئے۔ "ہوائی قلعے تعمیر کرنے" اور "خیالی پلاؤ پکانے" میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک دن یکایک ہمارے دوست صاحبان آٹپکے۔ ان کو دیکھ کر ہمارے "ہاتھوں کے طوطے" اُڑ گئے۔ مگر ان کو "ہاتھوں ہاتھ لینا" ہی پڑا کہ یہ ہماری اخلاقی ذمّہ داری تھی، مگر انہوں نے وہ ہاتھ دکھائے کہ چند ہی لمحوں میں پورا گھر "کباڑ خانے" کا منظر پیش کرنے لگا۔ انہوں نے "اُدھم مچا کر" "آسمان سر پر اُٹھالیا" ہم نے انہیں بار بار منع کیا مگر انہوں نے ہماری ایک نہ سنی اور شرارتوں سے ہمارے ناک میں دم کردیا۔ آخر بڑی "بھاگ دوڑ" کے بعد ان کو بھگا کر دم لیا اور "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔"

ابھی ہم نے "سُکھ کا سانس" لیا ہی تھا کہ ایک آواز سُنائی دی اور ہمارا "اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے" ہی رہ گیا۔ یہ ہماری امی جان کی آواز تھی وہ غصّے میں تھیں اور ہمیں بُلا رہی تھیں۔ ڈر کے مارے ہمارے "ہاتھ پاؤں پھُول گئے" اور گرتے پڑتے امی جان کے پاس آپہنچے۔ پہلے تو انہوں نے ہمیں "آنکھیں دکھائیں" اور خوب "آگ بگولہ ہوئیں۔" اور پھر فوراً حکم دیا کہ سبزی منڈی جا کر سبزی اور پھل خرید لاؤ۔ "چارو ناچار" تھیلا لے کر سبزی منڈی کی طرف چل پڑے۔ "پھونک پھونک کر" قدم رکھنے پڑ رہے تھے۔ کیونکہ سڑکوں پر کیچڑ اور گندگی کا انبار تھا جو کسی تجریدی آرٹ کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ سبزی منڈی میں لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ "تل دھرنے کو جگہ" نہ تھی۔ مگر ہمیں کہیں نہ کہیں تو پہنچنا ہی تھا۔ چنانچہ "ایڑی چوٹی کا زور" لگا کر دکان پر آدھمکے۔ مطلوبہ اشیا کی خریداری کے بعد اس رش میں سے نکلنے کی جدوجہد میں ایک زور دار دھکا لگا اور ہمیں "دن میں تارے نظر آگئے" تھیلا ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ہم زمین چاٹنے پر مجبور ہوگئے۔ "خدا خدا کر کے" اٹھے تو ایک اور بلا نازل ہوئی۔ پتا یہ چلا کہ ہمارے ہاتھوں میں تھیلے کا فقط تسمہ باقی ہے اور تھیلا یوں غائب ہے جیسے "گدھے کے سر سے سینگ" اب تھیلے کی ڈھنڈیا پڑی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم کیچڑ میں لت پت تھیلے کو پہچاننے میں کامیاب ہوگئے۔ تھیلا قبضے میں کرنے کے بعد تھیلے میں سامان کا جائزہ لیا تو ہمیں "دُنیا گھومتی ہوئی نظر آئی" بعید یہ کُھلا کہ تھیلے میں سے آدھا سامان غائب ہے ہم "لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئے" گھر کی طرف یوں روانہ ہوئے "جیسے لوٹ کے بدھو گھر کو آتے ہیں۔" گھر پہنچے تو امی جان ہماری حالت دیکھ کر "انگشت بدنداں" رہ گئیں۔ ہم نے ڈرے ڈرے انداز میں سارا واقعہ کہہ سُنایا مگر ان کے سامنے ہماری "دال نہ گلی" بہت سیخ پا ہوئیں اور ہمیں کھری کھری سُنائیں۔ اسی وقت ابو جان گھر میں داخل ہوئے ابو جان سے ہماری ویسے ہی جان جاتی تھی۔ انہیں دیکھ کر ہمارے "چھکے چھوٹ گئے" اور "حالت غیر ہوگئی" ابو جان گھر کی اور ہماری حالت کو دیکھ کر بہت "لال پیلے ہوئے" اور اس کے بعد ہم پہ جو گزری مت پوچھئے۔

ہدایت

ایک شہر میں ناقص پانی کی سپلائی پر اہل شہر نے احتجاج کیا تو محکمہ صحت کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ "تمام لوگ پانی ابال کر استعمال کریں۔ اگر برف استعمال کریں تو پہلے اسے بھی اچھی طرح ابال لیں۔ مرسلہ : طلال مجید، لاہور

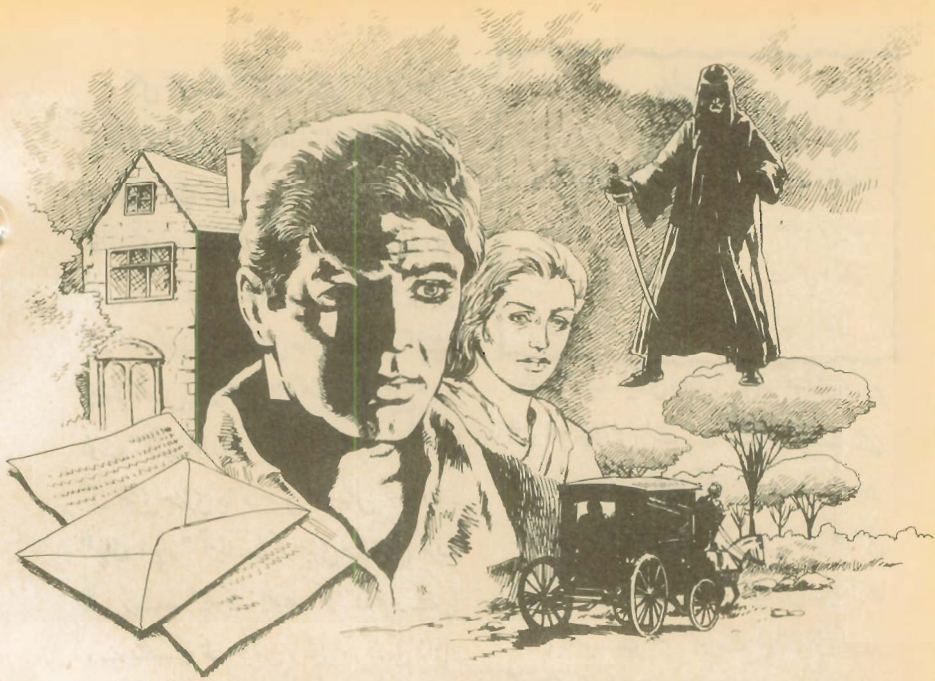

راج گڑھ کی حویلی

عبدالودود شاہ

چابک کا سڑاکا گونجا اور گھوڑے سرپٹ دوڑنے لگے۔ میں نے ترپال کا پردہ اٹھا کر دیکھا' بارش اسی زور وشور سے برس رہی تھی اور ٹوٹی پھوٹی سڑک پر گاڑی کو اس زور کے دھکے لگ رہے تھے کہ گویا اب الٹی یا تب الٹی۔ میں نے ذرا سا ہی پردہ ہٹایا تھا' اتنی دیر میں اندر آنے والی تیز بوچھاڑ نے مجھے تربتر کردیا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا' اس قدر اندھیرے میں گھوڑا گاڑی کا یوں سرپٹ دوڑنا' وہ بھی اس شکستہ راستے پر کسی بھی لمحے کسی خوفناک حادثے سے دوچار کرسکتا تھا۔ میں نے کوچوان کی طرف دیکھا کہ اسے آہستہ چلنے کو کہوں۔ لیکن دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کوچوان اپنی نشست سے غائب تھا۔ اوہ خدایا۔ کوچوان کہاں تھا؟ کہیں اچھل کر نیچے تو نہیں جاپڑا ہے اور گھوڑے اس کے بغیر ہی گھپ اندھیرے میں سرپر پیر دھر کر بھاگے جارہے

ہوں۔ پھر یہ چابک کا سڑاکا کیسا تھا؟ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ پیر جیسے مفلوج ہوگئے۔ حلق سے نکلنے والی چیخ کو بمشکل روکا اور اپنی نشست سے ایک جھٹکے سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن دوسرے ہی لمحے لگنے والے دھکے نے مجھے دوبارہ نشست پر گرا دیا۔

گاڑی ایک زبردست جھٹکے کے بعد کھڑکھڑا کر رک گئی اور اس کے ساتھ ہی مجھے جیسے ہوش آگیا۔ ستارہ کی آنکھیں اندھیرے میں بھی مجھے تشویش میں ڈوبی ہوئی لگیں۔ "کیا ہوا؟" اس کے لہجے کا اضطراب واضح تھا۔

"شاید..... شاید پہیہ گڑھے میں آگیا ہے!" میں نے حواس پر قابو پاکر کہا۔ ستارہ اپنی جگہ سے بمشکل اٹھی اور اس نے ترپال ہٹا کر باہر دیکھا۔ اسی لمحے بجلی کا کوندا لپکا۔ اور ہم دونوں نے بیک وقت کوچوان کو دیکھا جو اپنی نشست پر سے مڑ کر ہماری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ "صاحب کچھ ٹوٹ گیا ہے۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا اور نیچے کود گیا۔ اب میری سمجھ میں آیا' اس نے سیاہ برساتی پہن رکھی تھی۔ اس لئے اندھیرے میں پہلی نگاہ پر نظر ہی نہیں آیا۔ میں دھپ سے اپنی نشست پر واپس گر گیا۔ اس قسم کی گاڑی میں کچھ ٹوٹنے کا مطلب ہے کہ قصہ ختم۔! ستارہ نے ایمرجنسی لائٹ اٹھائی اور اسے آن کیا۔ لیکن روشنی نہ ہوئی۔ میں نے لائٹ نکال کر جلایا' اس کی روشنی میں جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن اسے چارج کئے ہوئے ایک عرصہ ہوا اور چلتے وقت چارج کرنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔ لہٰذا اس کا وجود اب بے کار تھا۔ ٹارچ نکال کر روشن کی' تو اس کی پیلی پیلی روشنی میں منظر کچھ اور بھی بھیانک لگا۔ بارش اسی زور و شور سے برسے جارہی تھی۔ اور کوچوان گاڑی کا معائنہ کررہا تھا۔ موصوف نے اعلان کیا کہ صاحب گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ میں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ کچھ زیادہ ہی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی لیکن راج گڑھ بھی یہاں سے کوئی نزدیک نہ تھا۔ "راج گڑھ کتنی دور ہے؟" میں نے بیٹھے بیٹھے دریافت کیا' اس نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا اور واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ کر برسات کا پانی جھٹکنے لگا "یہی کوئی آٹھ میل۔" بڑے آرام سے اس نے کہا اور میری رہی سہی جان بھی نکل کر حلق میں اٹک گئی۔ اس طوفانی بارش اور اندھیری رات میں کوئی کہاں جاسکتا ہے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی' مرکھپ کر کسی نہ کسی طرح جاسکتا تھا۔ لیکن ستارہ کے ساتھ بھلا کیچڑ' دلدل' موسلادھار بارش اور کڑکتی بجلی' اندھیری رات میں یہ سفر کیسے ممکن تھا۔

"کیوں بھئی ستارہ..... کیا ارادہ ہے؟" میں

نے ستارہ سے پوچھا۔ وہ کانپ کر بولی "خدا کے لئے اس وقت کچھ مت بولیں، میری جان نکلی جارہی ہے۔"

"واہ بڑی تیس مار نکلیں۔" میں نے مذاق اڑایا۔ "اچھا اب پیدل چلیں یا رات بھر یہیں رت جگا کریں؟"

ستارہ خاموش رہی، کوچوان چہکا۔ "جی ہاں صاحب اب صبح کے انتظار کے سوا کوئی چارہ کار نہیں..... صبح کوئی گاڑی ادھر آنکلے تو میں بھی کچھ کروں!" تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد، جس کو صرف بارش کا شور توڑ رہا تھا، ستارہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور ہاتھ بڑھا کر باسکٹ سے تھرماس نکالا۔ کوچوان بھی اگلا حصہ چھوڑ کر اندر آچکا تھا۔ ستارہ ایک طرف ہوگئی۔ گھوڑے خاموش سر جھکا کے کھڑے بھیگتے رہے..... بے چارے بے زبان جانور.....!! ستارہ نے تھرماس کھول کر کافی نکالی اور ہم دونوں کو دی، کافی نہایت خاموشی سے پی گئی اور کچھ کہنے کو رہ ہی نہیں گیا تھا..... میرے بہت اصرار پر اس نے دوچار گھونٹ حلق سے اتارے..... ورنہ وہ تیار نہیں تھی میں نے ٹھنڈ لگنے کے خیال سے زبردستی اسے کافی پلوادی۔ اب کسی کا انتظار قطعی فضول تھا..... لہٰذا میں نے ستارہ کو سو جانے کی ہدایت کردی۔ وہ ایک طرف سمٹ سمٹا کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس سردی اور بارش میں اور ویرانے میں بھلا اسے نیند کیسے آسکتی ہے۔ رات دھیرے دھیرے گزرتی گئی۔ معلوم نہیں کون سا پہر تھا۔ مجھے گھڑی دیکھنے کا خیال بھی نہ رہا، میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ کوچوان بھی اونگھ رہا تھا۔ نیند کی کیفیت یکایک ہی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ کسی کی درد میں ڈوبی ہوئی چیخ تھی جس نے مجھے بیدار کردیا تھا۔ آنکھ کھلی تو پہلے کچھ دیر سمجھ میں نہ آیا کہ کہاں ہوں؟ پھر روشنی کے ایک جھماکے کی طرح سب کچھ واضح ہوگیا۔ ستارہ اپنی جگہ سے غائب تھی اور چیخ بلا شک وشبہ اسی کی تھی، میں نے بغلی ہولسٹر میں ریوالور ٹٹولا اور بلا خوف گاڑی سے کود پڑا۔ بارش اب بھی ہورہی تھی اگرچہ اس میں پہلی سی شدت نہ تھی، لیکن بارش کا اپنا ایک رنگ ہوتا ہے جو ہر صورت میں رہتا ہے اور مجھے اپنی نیند پر حیرت تھی۔ ستارہ کہاں اور کیسے گاڑی سے اتر کر گئی؟ نہیں وہ خود نہیں جاسکتی۔ کبھی بھی نہیں..... اسے زبردستی لے جایا گیا ہے..... میں نے اندھیرے میں اندھا دھند اس سمت دوڑنا شروع کیا جدھر سے اس کی چیخ ابھری تھی۔ میں نے بھاگتے بھاگتے اندھیرے میں ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ کیچڑ پر گرنے سے بس بال بال بچا تھا..... ستارہ کی درد بھری چیخیں دور ہوتی جارہی تھیں۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا لیکن

اسے استعمال نہیں کر سکتا تھا گولی خود ستارہ کو بھی لگ سکتی تھی۔ بس ہونٹ بھینچے اندھا دھند دوڑتا رہا "شہزاد، شہزاد"۔ ستارہ کی آخری آواز آئی پھر میرے قدموں نے ایک ٹھوکر اور کھائی اور ذہن اندھیرے میں ڈوب گیا۔!

آنکھیں کھلیں تو میں ایک درخت کے نیچے پڑا تھا اور دن کا اجالا اچھی طرح پھیل چکا تھا، لیکن گھنے درختوں کی وجہ سے روشنی پھر بھی کھلی ہوئی نہ تھی۔ خدا جانے کب سے اور کہاں کہاں سے بھاگتے بھاگتے یہاں آپہنچا تھا۔! سارے جسم میں شدید درد ہو رہا تھا۔ شاید بارش میں بھیگنے کی وجہ سے بخار بھی چڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا کچھ دیر تک حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر بے سدھ ہو کر وہیں گر گیا۔ یونہی پڑے پڑے دن چھپ گیا اور رات نے ایک بار پھر اپنے پر پھیلا دیئے۔ مجھے پہلا اور آخری خیال صرف ستارہ کا تھا۔! پھر کسی کے دبے پاؤں چلنے کی آہٹ ابھری خوف سے میں نے جھرجھری لی اور کسی نہ کسی طرح سمٹ سمٹا کر درخت کے پیچھے چھپ گیا آہٹ ایک بار پھر ابھری پھر سکوت طاری ہو گیا۔ کوئی نہ کوئی تھا جو چھپ کر چل رہا تھا۔ اور بے خبری میں مجھے دبوچ لینا چاہتا تھا۔ یقیناً" اس جنگل میں بھوتوں کا بسیرا تھا۔ مجھے ستارہ کی بات یاد آئی، اسٹیشن سے گھوڑا گاڑی پر سفر کرنے سے پہلے اس نے کوچوان کو دیکھ کر پہلے تو انکار ہی کر دیا تھا۔ کس قدر غیر انسانی چہرہ تھا، کیا وہ انسانی بھوت تھا یا کوئی خونخوار بھوت؟ اس کی ناک تو تقریباً" غائب تھی اور آنکھیں اس حد تک دھنسی ہوئی تھیں کہ آنکھوں کی جگہ دو بھیانک گڑھے ہی نظر آتے تھے۔ اوپر سے سیاہ رنگ اور سیاہ برساتی نے اسے اور بھی بھیانک اور ڈراؤنا بنا دیا تھا تو یہ بھوتوں کا سردار ملا کوچوان تھا؟

آہٹ ایک بار پھر ابھری، پھر جھاڑیوں نے ایک ساتھ بہت سارے سائے اگل دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں قیدی بنایا جا چکا تھا۔ کسی نے میرے سر پر زور سے کوئی شے ماری اور میں پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ جس کمرے میں آنکھ کھلی وہ ضرور کسی بھوت کی رہائش گاہ رہا ہو گا اور پھر جب میں نے اندھیرے میں ٹٹولنا شروع کیا تو پہلی بار انگلیاں جس چیز پر ٹکرائیں، اس نے مجھے سر سے پاؤں تک کپکپا دیا۔ وہ یقیناً" کوئی ہڈی تھی خاصی لمبی، جیسے ٹانگ کی ہڈی ہوتی ہے۔" خدایا میں کہاں آگیا ہوں۔" دہشت سے میں وہیں منجمد ہو گیا۔

اور یہ تاثر اس وقت ٹوٹا جب کسی کی ہلکی ہلکی سسکیاں مجھ تک پہنچیں میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ یہ یقیناً" ستارہ تھی!

"ستارہ!" میں گلا پھاڑ کر چلایا۔ سسکیاں رک گئیں پھر ستارہ کی کانپتی ہوئی آواز گونجی

"شہزاد!"

میں پلٹا..... اف خدایا..... جس کو پاگلوں کی طرح تلاش کرتا رہا تھا وہ مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ میں نے اسے سہارا دیا وہ بُری طرح رو رہی تھی کانپ رہی تھی۔

میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے شاید کوئی بہت خوفناک منظر دیکھ لیا تھا.....! میری تسلی کا اس پر کوئی اثر نہ ہو سکا۔

"اُدھر دیکھو!" اس نے ایک طرف اشارہ کیا میں نے نیم اجالے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اور پھر کانپ کر رہ گیا ایک طرف کئی انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں ڈھیر تھیں۔ مجھے اب خود پر غصہ آنے لگا۔ میں نے ستارہ کی بات کیوں نہ مانی۔ توفیق چچا ہمارے دور کے رشتہ دار تھے۔ ان کی رہائش راج گڑھ میں تھی، اور کئی برسوں سے وہ امریکہ میں مقیم تھے اور ان کی حویلی خالی پڑی ہوئی تھی۔ ان کا خط کچھ ہی دن پہلے ملا تھا۔ جس میں انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں یا تو ان کی حویلی میں رہائش اختیار کرلوں یا اسے فروخت کر کے رقم اپنے اسکول میں لے آؤں۔ انہیں اس رقم کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے کئی گنا زائد وہ امریکہ میں کما چکے تھے۔ میں نے سوچا اچھی بات ہے حویلی اب بھی عمدہ حالت میں تھی، اچھی خاصی رقم ہاتھ آسکتی ہے اور میں نوکری چھوڑ کر اپنا کاروبار کر سکتا ہوں۔ میں کئی دنوں تک تذبذب میں رہا، لیکن آخر کار اس سفر کی ٹھان ہی لی تھی اور اس کا اختتام ایک اندھیرے تہہ خانے میں، مردوں کی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کے درمیان ہو رہا تھا۔

ہر طرف ایک بھیانک سکوت طاری تھا۔ اب مجھے صرف آنے والے وقت کا انتظار تھا.....مایوس ہونا میں نے نہیں سیکھا تھا آخری دم تک جنگ جاری رہے گی۔

پھر انتظار ختم ہو گیا۔

کمرے میں یکایک ہی ناقابل برداشت حد تک تیز روشنی پھیل گئی تھی۔ ستارہ خوف سے سمٹ کر میرے نزدیک ہو گئی۔ آنے والے کا قد و قامت ساڑھے چھ فٹ سے کسی طرح کم نہ ہو گا۔ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس چہرے کی جگہ گہری سیاہ رنگت میں جھانکتی خون آلود آنکھیں اور ہاتھ میں چمکتی ہوئی دو دھاری تلوار۔ ستارہ کانپتی ہوئی مجھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

سیاہ پوش چند لمحے ہم دونوں کو گھورتا رہا پھر اس کی آواز تہہ خانے میں گونجی :

"تم راج گڑھ جاؤ گے؟" یہ انتہائی غیر انسانی لہجہ تھا۔

"ہاں۔!" میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر اس نے قہقہہ لگایا۔ ستارہ یوں کانپ رہی تھی جیسے ابھی چکرا کر ڈھیر ہو جائے گی "تم ضرور راج گڑھ پہنچو گے۔" ہو ہو ہو ہو..... وہ ہنسا.....

میں اس دوران فیصلہ کر چکا تھا اور اگلے ہی لمحے میں نے اس پر چھلانگ لگا دی لیکن وہ بھی غافل نہیں تھا۔ صاف جھکائی دے گیا مجھے چکر سا آتا محسوس ہوا اور دوسرے ہی لمحے میں ہڈیوں نہیں بلکہ کھوپڑیوں کے اس ڈھیر پر جا گرا۔ سیاہ پوش نے دو قدم بڑھائے اور مجھے اٹھتا دیکھ کر چمکتی ہوئی تلوار گھمائی۔ اب پھرتی دکھانے کی باری میری تھی۔ ستارہ چیخ مار کر میری طرف لپکی تھی اور.... اگلے ہی لمحے چمکتی ہوئی تلوار اس سے ٹکرائی تھی اس کے بدن سے خون کا فوارہ چھوٹا تھا اور وہ زمین کی طرف گری تھی اور اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔

پھر صبح ہو گئی۔

میں نے اپنی جگہ لیٹے لیٹے ہاتھ پھیرا' میرا خیال تھا کہ اب پھر ہاتھ کیچڑ میں لت پت ہوں گے مگر اس کی جگہ تکیہ تھا' میں نے آنکھیں جھپکائیں۔ کیا یہ سب ایک خوفناک خواب تھا؟ باہر چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ پھر آہٹ ہوئی اور کوئی اندر داخل ہوا۔ یہ بلاشبہ ستارہ تھی۔ جس کے ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے تھی۔ جی ہاں وہی ستارہ میری بیوی' جو کل رات مجھے بچانے کی کوشش میں تلوار کا وار کھا کر مجھ پر قربان ہو چکی تھی مگر وہ تو مسکرا رہی تھی۔

"ستارہ!" میں زور سے چیخا "اوہ خدایا .....یہ تم ہی ہو؟"

ستارہ نے چونک کر میری طرف دیکھا "کیا بات ہے شہزاد آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔" تم .... تم زندہ ہو؟ تم تو.... تم تو.....!" میں نے کہنے کی کوشش کی لیکن حلق سے کچھ نہ نکل سکا۔ میں بھلا کیسے اسے یقین دلاتا کہ وہ کل رات میرے سامنے قتل کی جا چکی ہے اور آج صبح میرے لئے ناشتہ لے کر آگئی ہے۔

ستارہ نے تشویش سے میری طرف دیکھا "آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے؟"

"خواب؟ نہیں نہیں ....یہ خواب ہرگز نہیں تھا!"

میں اٹھ کر غسل خانے چلا گیا۔ ستارہ الجھی الجھی سی باہر نکل گئی۔ میں غسل خانے سے باہر آیا تو وہ اخبار ڈال کر واپس باورچی خانے میں جا گھسی تھی

"ستارہ۔ ذرا توفیق چچا کا خط دینا۔" میں نے غیر ارادی طور پر کہا۔

"خط ....؟ کیسا خط؟" اس نے وہیں سے پوچھا۔

"وہ جو آٹھ دس دن پہلے آیا تھا؟"

"یہی ..... کوئی دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے ہاں ایک خط آیا تو تھا!" اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی اور اندر آگئی "یاد نہیں آرہا کس کا تھا؟ اچھا لاتی ہوں۔" وہ خط دے کر چلی گئی..... میں نے کانپتے ہاتھوں سے اخبار چھوڑ کر خط اٹھالیا۔ خط پر درج تاریخ کو دیکھ کر ذہن پر ایک اور جھماکا ہوا..... خط پر ان کے ہاتھ کی ۱۸ اگست ۱۹۸۵ء کی تاریخ درج تھی..... اور ..... توفیق چچا کا انتقال تو ۱۲ جنوری کو ہو چکا تھا۔ لیکن ہینڈ رائٹنگ تو بلاشبہ انہی کی تھی اور خط مجھے چند ہفتے قبل ہی ملا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ..... یہ کیسے ہو سکتا تھا پھر ستارہ نے یہ خط مجھے کیسے لا کر دیا تھا؟

"یہ ..... یہ توفیق چچا کا خط ہے؟" میں نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

"توفیق؟ نہیں نہیں شفیق کا خط ہے؟" ستارہ نے وہیں سے کہا۔ اور پھر میرے پاس آگئی "غور سے دیکھو خط پر انہی کا نام پتہ درج ہے!" ستارہ سوچ میں پڑ گئی۔ "شاید ڈاک خانے والوں نے گڑبڑ کی ہے۔ خط دیر سے پہنچایا ہے۔" میں نے خط خاموشی سے اس کی طرف بڑھا دیا۔ تاریخ دیکھ کر خط اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ یہ ایک ایسا خط تھا جو لکھنے والے نے اپنی موت کے آٹھ ماہ بعد لکھا تھا اور اس پر جس شہر اور حویلی کا ذکر تھا اور جس کا ہم نے سفر کیا تھا' اس کا کہیں وجود نہ تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ غیر ارادی طور پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو کوئی کاغذ جیب میں چرمرایا۔ میں نے کاغذ نکال کر دیکھا کسی نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اور اکھڑی اکھڑی تحریر میں پینسل سے شکستہ حروف میں لکھا تھا۔

"میں مر رہا ہوں۔ اس وقت نیکی کا یہی کام کر سکتا ہوں کہ لوگوں کو اس منحوس بستی راج گڑھ آنے سے اور اس بھیانک حویلی میں قدم رکھنے سے منع کر دوں۔۔۔ کاش میں یہاں نہ آتا اور جو کچھ دیکھا ہے نہ دیکھتا۔ یہاں صرف موت ہے موت....." یہاں پراسرار اور بھیانک پیغام ختم ہو گیا۔ بوسیدہ سے کاغذ پر کسی کا نام پتہ درج نہ تھا.....! لیکن ..... راج گڑھ کا کہیں وجود نہیں تھا نہ توفیق چچا کی کوئی حویلی کبھی وہاں تھی۔ نہ ہم کبھی اس بھیانک سفر پر گئے تھے اور توفیق چچا کا آٹھ ماہ قبل انتقال ہو چکا تھا لیکن اس خط سے ثابت ہو رہا تھا کہ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ سچ تھا۔

راج گڑھ ..... حویلی ..... کھوپڑیاں.....!

اور ستارہ زندہ تھی اور راج گڑھ کا ہی کوئی وجود نہ تھا..... پھر یہ پرچہ اور اس کی خوفناک تحریر جیب میں کب کہاں سے اور کیسے آئی!!

تصویریں یہ..... بتلاتی ہیں
محبت ہاں..... سکھلاتی ہیں

یورپیین ممالک میں جانوروں کا کتنا خیال رکھا جاتا ہے اور ان سے کتنی محبت کی جاتی ہے' اس کا اندازہ ان تصاویر سے کیا جا سکتا ہے ۔ اس تصویر میں کینیڈا کے مویشی فارم میں ایک بچھڑا بیمار پڑ گیا تو سارا عملہ پریشان ہو گیا۔ فوراً ڈاکٹر ایلیس کو فون کیا گیا۔ انہوں نے آ کر بچھڑے کی بیماری تشخیص کی اور اسے اِنجکشن لگانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بچھڑا آپ بچوں کی طرح اِنجکشن سے بہت ڈرتا ہے عملے کے افراد نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور ڈاکٹر ایلیس بڑے پیار سے کہہ رہے ہیں۔ "گھبراؤ نہیں مُنّے! ذرا سی دیر کی بات ہے پھر تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

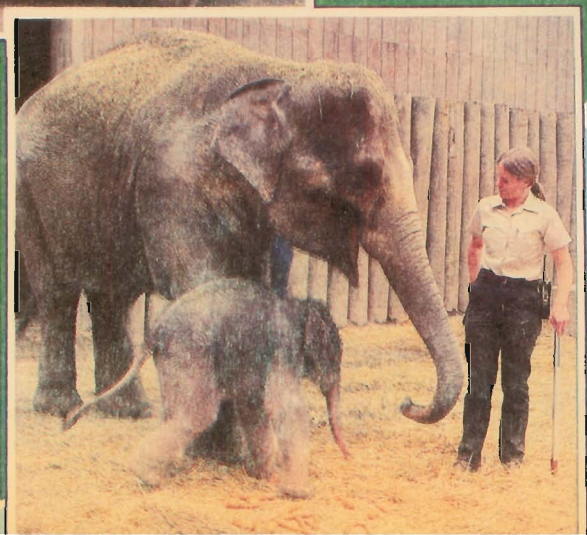

سلاٹر نامی ہتھنی کے بچے کو سُرخ سُرخ گاجریں بے حد پسند ہیں لیکن آج یہ نخرے کر رہا ہے اس کی نگراں کہہ رہی ہے :
"پلیز سلاٹر! گاجریں کھا لو ناں۔ بہت مزے کی ہیں!!"

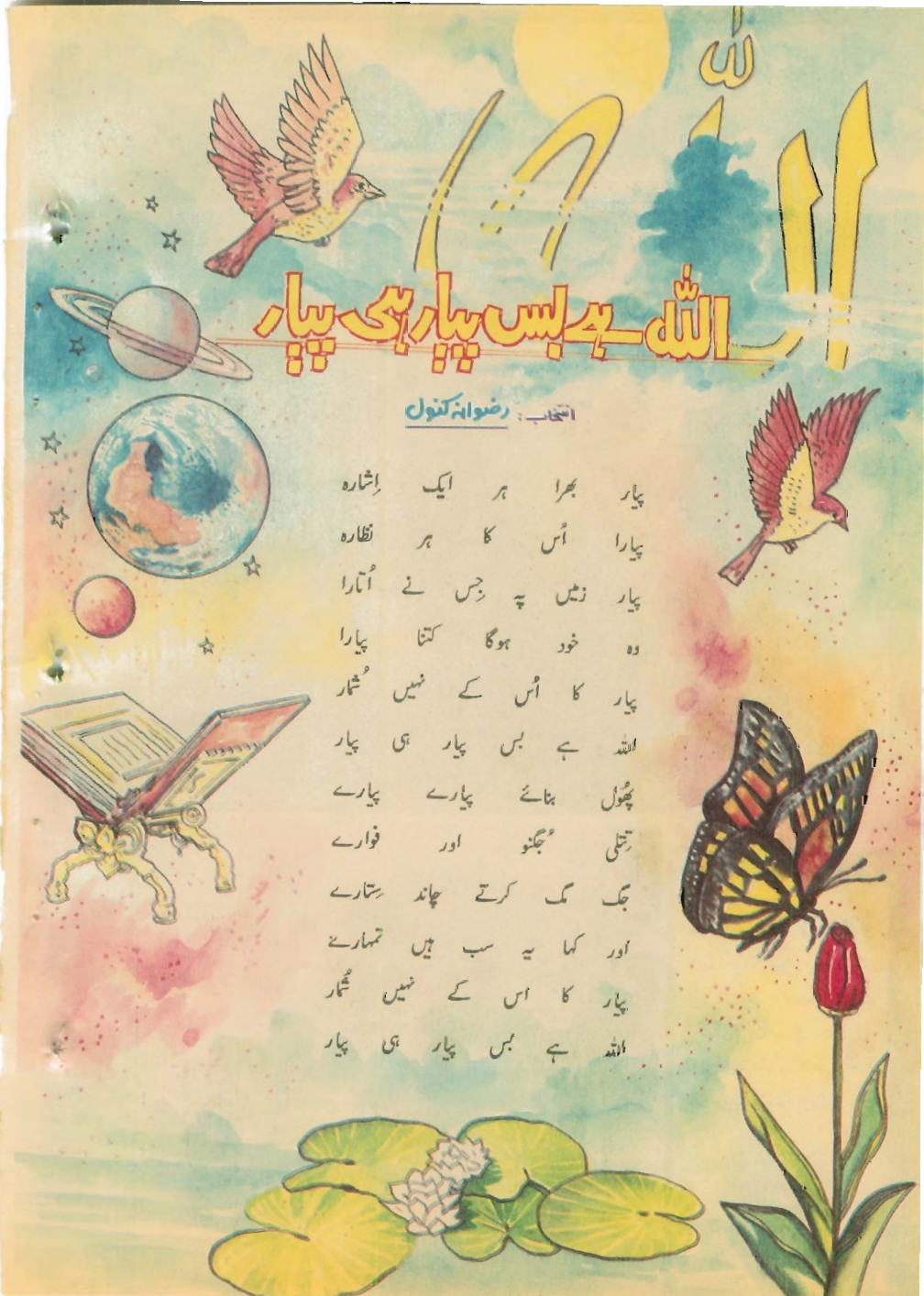

اللہ ہے بس پیار ہی پیار

انتخاب: رضوانہ کنول

پیار بھرا ہر ایک اِشارہ
پیارا اُس کا ہر نظارہ
پیار زمیں پہ جس نے اُتارا
وہ خود ہوگا کتنا پیارا
پیار کا اُس کے نہیں شُمار
اللہ ہے بس پیار ہی پیار
پھول بنائے پیارے پیارے
تتلی جگنو اور فوارے
جگ مگ کرتے چاند ستارے
اور کہا یہ سب ہیں تمہارے
پیار کا اس کے نہیں شُمار
اللہ ہے بس پیار ہی پیار

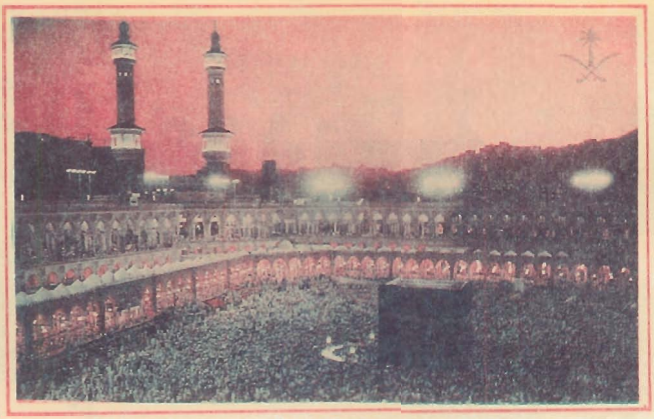

اسلامی شہروں کا تعارف

الطاف حسین

المکۃ المکرمہ

مقدس ترین شہر

دنیا کے سب سے مبارک اور مقدس ترین شہر المکتہ المکرمہ کو اپنی کئی قابلِ رشک خصوصیات کے لحاظ سے دنیا کے تمام شہروں پر فضیلت حاصل ہے۔ یہی وہ عظیم شہر ہے جسے آج سے ۴۰۷۱ سال پہلے ۲۰۷۶ قبل مسیح میں حضرت ابراہیمؑ نے ملک شام سے دنیا کی پہلی ہجرت کرنے کے بعد آباد کیا تھا۔ اس تقدس بھری سرزمین کی تپتی ریت سے حضرت اسمٰعیلؑ کے لئے آبِ زم زم کا چشمہ جاری ہوا اور پھر ۲۰۸۷ ق م میں اسی قابلِ احترام شہر میں ذبحِ عظیم کا ایمان افروز واقعہ رونما ہوا جو بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لئے باعث تقلید ٹھہرا۔ ۲۰۹۴ ق م میں اس خطّہ پاک کو ایک اور منفرد مقام حاصل ہوا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے حکم سے طوفانِ نوحؑ کے دوران مِٹ جانے والے خانہ کعبہ کا اصل مقام دریافت کر کے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے ہمراہ بیت اللہ کی از سرِ نو تعمیر فرمائی اور حجِ کعبہ کی ابتدا کی جو دینِ اسلام کا ایک اہم رُکن قرار دیا گیا اور پھر ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کو حضور نبی کریمؐ کی مبارک صورت میں وہ عظیم الشان نُور ظاہر ہوا جس نے مکہ مکرمہ کو عظمتوں کی ناقابل دسترس بلندیوں تک پہنچادیا۔

قرآن پاک کی پہلی وحی اسی شہر میں نازل ہوئی۔ جس کے بعد حضورؐ نے بنی نوع انسان کو

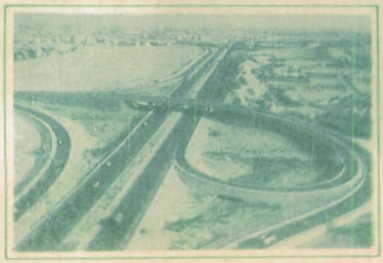

دنیا کے سب سے عظیم المرتبت مذہب اسلام کی بشارت دیتے ہوئے روشن منزلوں کی راہ دکھائی اور مکہ مکرمہ اسلام کے سب سے بڑے تبلیغی مرکز کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر اُبھرا۔

خلافتِ راشدہ کے بعد مکہ مکرمہ خلافتِ بنو امیہ، بنو عباس، فاطمین مصر اور سلطنتِ عثمانیہ (ترکی) کا حصّہ رہا۔ ان مختلف خاندانوں کے دورِ حکومت میں تقریباً ۲۴۵ حکومتی عہدیداروں نے مکہ مکرمہ کی گورنری کے فرائض سرانجام دیئے۔ مکہ مکرمہ کے پہلے امیر (گورنر) حضرت عتاب بن اسید تھے۔ جنہیں یہ اعزاز شوال ۸ھ (۶۳۰) میں حضورؐ نے غزوۂ حنین پر تشریف لے جاتے ہوئے عطا فرمایا تھا۔

جلیل القدر خانہ کعبہ، بابرکت مسجد الحرام، قابلِ احترام مقاماتِ مقدّسہ، پُر نور پہاڑوں، تقدس بھرے غاروں، قدیم و جدید فنِ تعمیر کی شاہکار فلک بوس عمارتوں، خوبصورت اور پُرکشش تفریح گاہوں، سرسبز و شاداب وادیوں، لہلہاتے باغوں، علم کے میناروں، کشادہ اور تیز رفتار شاہراہوں اور جدید سہولتوں سے آراستہ حیرت انگیز زمیں دوز گزرگاہوں نے اس عظیم ترین شہر کو ناقابلِ بیان حسن و دلکشی کا ایسا مسحور کُن شاہکار بنادیا ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

مکہ مکرمہ، مدینہ منور سے ۴۴۷ کلو میٹر کے فاصلے پر وادی، ابراہیمؑ کے دامن میں واقع ہے۔ سطح سمندر سے ۳۳۰ میٹر بلند اس شہر کا رقبہ ۴۰ مربع کلو میٹر اور آبادی ۲۶۱۰۰۰۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ اس میں سے بیس لاکھ افراد دنیا کے مختلف ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۶۹ فیصد لوگ شہر

اور بقیہ ۳۱ فیصد دیہات میں رہتے ہیں۔

مکہ مکرمہ کے سو سے زائد ناموں میں سے چند یہ ہیں بکہ (گردن جھکادینے والا)، وادی غیر ذی زرع، البلاد امین، بیت العتیق، بیت الحرام، ام القریٰ، عروس البلدان، ام الرحمتہ، ام زحم، البینۃ، القریۃ، الحاطمۃ (ظالموں اور جابروں کو تباہ و برباد کردینے والا)، الراس (انسانی سر سے مشابہت رکھنے والا) القادس، کوثی، الباسہ (بے دین لوگوں کو باہر نکالنے والا) یعنی قیامت کے دن یہ شہر اپنے اندر دفن تمام بے دین لوگوں کو اپنی حدوں سے باہر نکال پھینکے گا۔ اسی طرح کانا دجال دنیا کے ہر شہر میں گھس جائے گا لیکن مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ہزار کوشش کے باوجود داخل نہ ہوسکے گا۔

عید اب کے برس بھی آئی ہے چپکے چپکے

اے بشیر

عید اب کے بھی برس آتی ہے چپکے چپکے
دیکھئے کیا ہمیں دکھلاتی ہے چپکے چپکے

عید اب کے بھی برس آتی ہے چپکے چپکے

کوئی رونق نظر آتی نہیں بازاروں میں
اتنی بے کیفی تو ہوتی نہیں تہواروں میں

کیوں کلی دل کی یہ مرجھاتی ہے چپکے چپکے
عید اب کے بھی برس آتی ہے چپکے چپکے

سہمی سہمی ہوئی صورت ہے سبھی بچّوں کی
کوئی ضد ہی نہیں جوتوں کی نئے کپڑوں کی

زندگی کیا انہیں سمجھاتی ہے چپکے چپکے
عید اب کے بھی برس آتی ہے چپکے چپکے

قتل و خوں ریزی کی یہ کیسی گھٹا آئی ہے
عید سے پہلے ہی ماتم کی فضا چھائی ہے
موت ہر گام پہ ٹکراتی ہے چپکے چپکے
عید اب کے بھی برس آتی ہے چپکے چپکے

ہر جگہ شہر میں ماتم نظر آتا ہے ہمیں
عید کیسی کہ محرم نظر آتا ہے ہمیں
سانس سینے میں گھٹی جاتی ہے چپکے چپکے
عید اب کے بھی برس آتی ہے چپکے چپکے

گر قدم گھر سے نکالیں تو خطرہ لگتا ہے
اب تو مسجد میں بھی جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
جانے کس سمت سے موت آتی ہے چپکے چپکے
عید اب کے بھی برس آتی ہے چپکے چپکے

تحفۂ عید ہے کیا؟ آہ و فغاں لاشیں ہیں
خون کے اشک ہیں، آہیں ہیں جواں لاشیں ہیں
آگ سینے میں لگی جاتی ہے چپکے چپکے
عید اب کے بھی برس آتی ہے چپکے چپکے

کیسی پُرہول قیامت کی یہ عید آئی ہے
زندگی موت کے پہلو میں سمٹ آئی ہے
ہر خوشی آہ بنی جاتی ہے چپکے چپکے
عید اب کے بھی برس آتی ہے چپکے چپکے

وہ عید کب آئے گی

محمد عمر احمد خان

بازار میں بہت رش تھا۔ چمکتی دمکتی دُکانیں، ان میں سجا سامان خریداروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ شیشے کے شوکیس میں سجے کپڑے، سوٹ، موزے نئے نئے ڈیزائن کے چمکیلے جوتے اور مختلف رنگ برنگے سامان دل للچا رہے تھے، پیسوں والوں کو اپنے قریب بُلا رہے تھے۔ رنگوں اور خوشبوؤں کا سیلاب بازار میں پھیلا ہوا تھا۔ عید کی خوشیاں دھنک کے رنگ بکھیرتی لوگوں کے چہروں پر تتلیوں کی طرح منڈلا رہی تھیں۔

اٹھائیسواں روزہ تھا اور محمد علی بہت خوش تھا۔ اس کے پورے روزے آرہے تھے اور آج اپنے نئے جوتے خریدنے صدر بازار آیا ہوا تھا۔ اس کی جیب میں تین سو روپے تھے اور وہ بہت خوش تھا..... دو مہینے پہلے جو جوتا وہ دیکھ کر گیا تھا، وہ پورے تین سو کا تھا۔ کالے رنگ کا وہ چمکیلا جوتا بہت خوبصورت تھا اور کئی ہفتوں سے اس کا

دل اس جوتے میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس دکان کی طرف جا رہا تھا جہاں اس کا مطلوبہ جوتا موجود تھا۔

محمد علی کے گھر کے حالات ایسے نہیں تھے کہ گھر والے اسے نیا جوتا دلا دیتے۔ کئی سالوں سے اس نے عید پر نیا جوتا نہیں پہنا تھا۔ بلکہ جب سے اس کے ابو کا انتقال ہوا تھا تب سے نہیں پہنا تھا۔ ابو جب زندہ تھے' اس کی عید کی فرمائش پوری کر دیتے تھے۔ لیکن اب وہ اللہ میاں کے پاس چلے گئے تھے تو کوئی اس کی فرمائش پوری کرنے والا نہ رہا تھا۔

اس کے ابو بس کے حادثے میں مرے تھے۔ بس کسی گاڑی سے نہیں ٹکرائی تھی نہ ہی فٹ پاتھ پر چڑھی تھی اور نہ ہی پل سے گری تھی۔ بس وہ تو چلتے چلتے ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ گئی تھی۔ کسی نے اس میں بم رکھ دیا تھا۔ جس شخص نے بم رکھا تھا اسے پیسوں سے محبت ہوگی اور اپنی خواہشات سے۔ اسے اس بات سے کوئی دکھ نہ ہوا ہوگا کہ اس بس میں مرنے والے لوگوں کے ساتھ ساتھ کتنے خاندان ختم ہو گئے ہوں گے۔

محمد علی کے ابو کہتے تھے "جو پیسوں سے محبت کرتے ہیں وہ انسانوں سے پیار نہیں کرتے۔ وہ بہت چھوٹے لوگ ہوتے ہیں جب کہ انسانوں سے پیار کرنے والے بڑے لوگ ہوتے ہیں۔"

ابو کے مرنے کے بعد اس نے اسکول چھوڑ دیا تھا اور صدر میں ایک سُنار کی دُکان پر کام سیکھنے لگا تھا۔ ایک سال کے عرصے میں اس نے پورا کام سیکھ لیا۔ وہاں اسے پندرہ سو روپے ملتے تھے۔ جو وہ ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ اس کی والدہ سلائی کڑھائی کا کام کرتی تھیں۔ گھر کا خرچ تنگ دستی کے باوجود اللہ کے فضل سے چل ہی رہا تھا۔

پچھلی دو عیدیں جو گزری تھیں' اس پر اس کے پاس اتنے پیسے تھے کہ وہ نیا جوتا لے سکتا تھا لیکن ایک عید پر چھوٹا بھائی بیمار ہو گیا تھا جب کہ دوسری عید پر ماں کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور وہ پیسہ جو اس نے بچت سے جمع کیا تھا' ان کی دوا دارو پر لگ گیا تھا۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتا اس دُکان کے نزدیک پہنچ گیا جہاں شیشے کے شوکیس میں رکھا چمکیلا جوتا اسے گھُور رہا تھا اور چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا۔ "جلدی کرو محمد علی! ورنہ کوئی آکر مجھے لے جائے گا۔" محمد علی جلدی سے دُکان کے اندر داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ کوئی اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ "دے دے کچھ اللہ کے نام پر دے دے!" وہ ایک ہٹا کٹا مُسٹنڈا فقیر تھا۔

"اتنے ہٹے کٹے ہو..... بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی۔" محمد علی نے فقیر سے کہا۔ فقیر نے بات سُنی ان سُنی کر دی۔ "دے دے کچھ' اللہ

کے نام پہ دے دے۔"

اس نے ٹیپ ریکارڈ میں پھنسا ایک ہی جملہ دہرایا۔ "ہٹو سامنے سے!" محمد علی نے اسے ایک طرف ہٹایا اور دُکان کی طرف بڑھ گیا لیکن دُکان کے گیٹ پر پہنچ کر یکدم جیسے رک گیا۔ "فقیر نے اللہ کا نام لیا ہے۔" وہ سوچنے لگا اور پھر جیب سے مُڑا تُڑا ایک روپیہ نکالا اور پلٹ کر فقیر کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "شرم کرو بابا! بھیک مانگ رہے ہو اور اللہ کا نام لے کر مانگ رہے ہو' اللہ بھیک مانگنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے!!" اتنا کہہ کر وہ دُکان میں گھس گیا کچھ ہی دیر بعد جب وہ دُکان سے باہر نکلا تو اس کی بغل میں ایک ڈبا دبا ہوا تھا نئے جوتوں کا ڈبا اور وہ بہت خوش خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"اس بار مہنگائی کے باوجود بھی میں بچت کے پیسوں سے جوتا لینے میں کامیاب ہوگیا ہوں یہ سب اللہ کی مہربانی ہے۔" وہ بس اسٹاپ کی طرف آتے آتے اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔ اس کے باپ نے اسے یہی بتایا تھا کہ مشکل کاموں میں اللہ ہی مدد کرتا ہے۔

وہ اسٹاپ پر آکر کھڑا ہوا تھا کہ بس آگئی اور وہ بس میں سوار ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں بس مسافروں سے بھر گئی تو چل پڑی۔

محمد علی کو سیٹ کھڑکی والی ملی تھی۔ یہ اس کی پسندیدہ سیٹ تھی۔ باہر کے نظارے دیکھنے میں اسے بے حد مزا آتا تھا لیکن آج تو اس کی ساری دلچسپی اور ساری خوشی اس جوتے کے ڈبے میں چُھپی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے ڈبے کو تھوڑا سا کھولتا' جوتوں کو دیکھتا اور پھر ہولے سے مُسکرانے لگتا۔

بس منزلیں عبور کرتی تیز رفتاری سے چلی جارہی تھی۔ اس کا اسٹاپ قریب آرہا تھا۔ بس ایک اسٹاپ پر رُکی تو اس کے ساتھ بیٹھے لوگ اُتر گئے اور کچھ نئے مسافر بس میں سوار ہوئے۔ ایک بوڑھا آدمی جو آنکھوں سے نابینا تھا ایک بچے کے ساتھ بس میں چڑھا۔ یہ بچہ محمد علی ہی کی عمر کا تھا۔ اتنا ہی بڑا قد ویسا ہی ڈیل ڈول۔ وہ محمد علی کے قریب خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ محمد علی نے سمٹ کر بوڑھے آدمی کے لئے جگہ بنادی اور بوڑھا آدمی بھی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت محمد علی ڈبا کھول کر اپنے نئے جوتے پر بڑے چاؤ سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ "کتنا مزا آئے گا جب عید والے دن میں اسے پہنوں گا۔" وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے پاس بیٹھے ہوئے ملگجے کپڑوں میں ملبوس بچے نے بڑی حسرت سے اس کے نئے جوتوں کی طرف دیکھا پھر بوڑھے آدمی کا ہاتھ ہلاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "دادا! کتنا اچھا ہوتا اگر غریبوں کے پاؤں نہیں ہوتے پھر ہمیں بھی نیا جوتا خریدنے کی

خواہش نہ ہوتی۔" محمد علی کو یوں لگا جیسے یہ جملہ ایک بم ہو جو اس بچے نے اس کے جوتے سے باندھ دیا ہو پھر اس کی نگاہیں بچے کی پاؤں کی طرف گئیں بچے کے پاؤں میں کوئی چپل تک نہ تھی وہ ننگے پیر تھا۔

کنڈیکٹر نے اس کے اسٹاپ کا نام لیا تو محمد علی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اسے اپنے باپ کا جملہ یاد آرہا تھا "جو لوگ پیسوں اور خواہشات سے محبت کرتے ہیں وہ بہت چھوٹے لوگ ہوتے ہیں۔"

"میرا نیا جوتا اس کے پاؤں میں بالکل فٹ آئے گا۔" اس نے اپنے ہم عمر بچے کی طرف دیکھا جو بارہ تیرہ سال کا ہی ہوگا۔ پھر بچے کی گود میں جوتے کا ڈبا رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارے لئے تحفہ ہے میری طرف سے!" اتنا کہہ کر اور اس بچے کو حیران و پریشان چھوڑ کر وہ جلدی سے بس سے اُترا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

سامنے پان کی دُکان پر کچھ لوگ کھڑے حکمرانوں کی بُرائیاں کر رہے اور مہنگائی کا رونا رو رہے تھے۔ محمد علی ان کے قریب سے گزرا تو ایک دم سے اسے یوں لگا جیسے اس کی ایڑی میں کوئی چیز چُبھ گئی ہو۔ اس کی ہوائی چپل ایڑی کے پاس سے تقریباً ختم ہو چلی تھی وہیں سے ایک کانچ کا ٹکڑا اس کا پاؤں ہلکے سے زخمی کر گیا تھا۔

وہ جُھک کر اپنے زخم کو دیکھنے لگا۔ دُکان پر کھڑے ایک صاحب کہہ رہے تھے "اس حکومت کو غریبوں کا ذرا احساس نہیں۔ اس نے تو مہنگائی کر کے غریبوں کی کمر توڑ دی ہے۔ اسے غریبوں کی خواہشات اور ان کی تمناؤں کا کب خیال آئے گا' وہ عید کب آئے گی جب اس ملک میں!..... خوشحالی ہوگی؟؟؟"

اور محمد علی اپنے زخم کو صاف کرتے ہوئے بڑے یقین سے سوچ رہا تھا۔ وہ عید ضرور آئے گی جب عوام کی اپنی حکومت ہوگی تب کسی غریب کا پاؤں نہیں کٹے گا اور..... اور وہ بھی نیا جوتا پہن سکے گا!!"

ہار اتار کر بیچ ڈالا

حضور اکرم ؐ کو اپنی صاحبزادی فاطمہ ؓ سے بڑی محبت تھی۔ مگر یہ محبت امیر عرب ؐ نے بیش قیمت کپڑوں اور سونے چاندی کے زیوروں کے ذریعے سے ظاہر نہیں فرمائی۔ ایک دفعہ حضرت علی ؓ کا دیا ہوا سونے کا ہار حضرت فاطمہ ؓ کے گلے میں دیکھا تو فرمایا۔

"اے فاطمہ ؓ تم کیا لوگوں سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ محمد ؐ کی بیٹی گلے میں آگ کا طوق ڈالے ہے۔" حضرت فاطمہ ؓ نے اسی وقت وہ ہار اتار کر بیچ ڈالا اور اس کی قیمت سے ایک غلام خرید کر آزاد کر دیا۔

مرسلہ:۔ وسیم شوکت۔ گوجرانوالہ

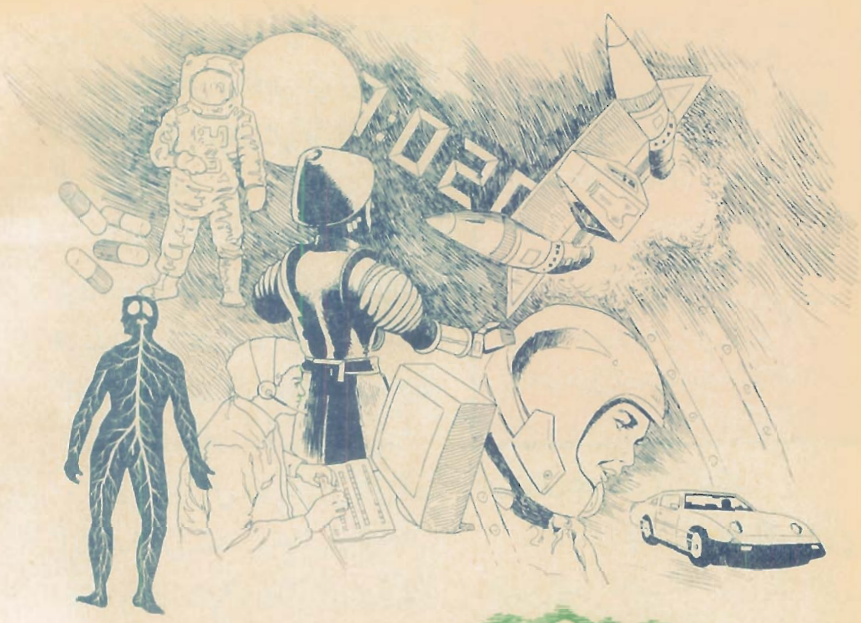

عقل کے کرشمے

یاسر اعجاز

کچھ عرصہ قبل آپ نے "آنکھ مچولی" کے شمارے میں پرانے زمانے کے لوگوں کے بارے میں بعض دلچسپ باتیں پڑھی تھیں۔ ذیل میں انسان کی ترقی کے بارے میں چند دلچسپ باتیں پیش کی جارہی ہیں۔

۱۔ خلاباز خلا میں کیا کھاتے ہیں؟

خوراک انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ کوئی انسان خوراک کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خلاباز جب خلا میں جاتے ہیں تو انہیں بھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر عام طریقوں سے خوراک کو خلا میں لے جایا جائے تو وہ بہت جلد خراب ہو جاتی ہے۔ اس لئے خلا میں استعمال کے لئے ایک خاص قسم کی غذا کھاتے ہیں جسے AFD FOOD یا AFD خوراک کہتے ہیں۔ اس خوراک میں وہ تمام وٹامن پائے جاتے

ہیں جو کسی بھی دوسری تازہ خوراک میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا وزن بہت کم ہوتا ہے اور اسے ریفریجریٹر میں رکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اس کو تیار کرتے وقت پہلے اسے جمایا جاتا ہے اور پھر اسے خشک کر لیا جاتا ہے۔ ایک مشین تازہ خوراک کو 17 ڈگری تک منجمد کرتی ہے۔ اور ایک اور مشین 30 ڈگری پر اسے منجمد کرتی ہے۔ پھر ایک مشین خوراک میں سے سارا پانی نکال لیتی ہے۔ اور یہ A F D غذا بن جاتی ہے۔ جب اس کو استعمال کرنا ہوتا ہے تو خلاباز اس میں ایک خاص مشین کی مدد سے پانی شامل کر لیتے ہیں۔

۲۔ کیا ہم زیرزمین شہر میں رہ سکتے ہیں؟

موسم تو تبدیل ہوتے ہی رہتے ہیں کبھی سردی اور کبھی گرمی۔ لیکن جب سخت سردی یا سخت گرمی پڑنا شروع ہو جائے تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ انٹارٹیکا میں سخت سردی کی وجہ سے لوگ برف کی سرنگوں میں زیرزمین گھروں میں رہتے ہیں۔

روس میں، انسٹی ٹیوٹ نارورن آرکیٹکچر میں کچھ لوگ ایک زیرزمین شہر کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ یہ شہر ایک بہت بڑے چھت یا گنبد کے نیچے ہوگا۔ اس گنبد کے نیچے انفرائیڈریز Infra-red Rays حرارت کو مناسب رکھیں گی۔ ہوا صاف ستھری ہوگی اور درخت اور پھول سارا سال شہر میں اگیں گے۔

۳۔ انسان کتنی تیزی سے سفر کر سکتا ہے؟

خلائی گاڑی اپالو ۱۰ تین امریکیوں تھامس سٹیفروڈ، یوگین کرنین اور جون ینگ کو ۳۹۸۲۴ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء کو خلا میں لے کر گئی۔ جہاں انسان نے خلا میں اتنی تیزی سے سفر کیا ہے وہاں..... خشکی اور پانی پر بھی بڑی تیزی سے سفر کیا ہے۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ کو ایک امریکن شخص گیری گیبلچ (Garry Gabelich) نے امریکہ میں اپنی کار "دی بلیو فلیم" کو ۱۰۴۰ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلایا۔ ایک برطانوی "ڈونلڈ کیمپ بیل" نے انگلینڈ میں "بلیو برڈ" کو پانی میں ۵۲۷ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے ۴ جنوری ۱۹۶۷ کو چلایا۔

۴۔ کیا ہمیں اب کاغذ کی ضرورت ہے؟

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہر شخص ہر سال تقریباً ۱۸۱ کلو گرام کاغذ استعمال کرتا ہے۔ امریکہ ہر سال ۴۴ ملین ٹن کاغذ پیدا کرتا ہے۔ اب کاغذ کی تقریباً ۷۰۰۰ مختلف اقسام ہیں۔ لیکن اب کاغذ کی جگہ مائیکرو فلم نے لے لی ہے۔ ایک عام کتابوں کی لائبریری ٹنوں کے حساب سے کاغذ رکھتی ہے مگر ایک مائیکرو فلم لائبریری بہت چھوٹی سی ہوتی ہے۔ ایک بہت بڑی کتاب کو چھوٹا کر کے صرف ۵ سم چوڑی اور ۶.۱ سم لمبی مائیکرو فلم پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ میں کانگریس لائبریری میں مائیکرو فلم

فکر

ایک کرایہ دار نے آدھی رات کو مکان کے مالک کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مکان کے مالک نے نیند سے بیدار ہو کر جلدی سے دروازہ کھولا تو کرائے دار نے کہا میں یہ کہنے آیا ہوں کہ میں اس ماہ کرایہ ادا نہیں کر سکوں گا۔ مالک مکان غصے سے بے قابو ہو کر بولا لیکن یہ بات تو تم مجھے صبح بھی بتا سکتے تھے آدھی رات کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کرایہ دار نے اطمینان سے جواب دیا جناب میں نے سوچا کہ اس فکر میں میں اکیلا ہی کیوں جاگتا رہوں۔

مرسلہ: ملک عبدالرشید، گوجرانوالہ

کتابیں موجود ہیں۔

۵۔ ٹائپ رائٹر اب کیا کیا کر سکتے ہیں؟

۱۹۶۲ء میں چینیوں نے ایک ٹائپ رائٹر بنایا اس میں ۵۸۵۰ چینی حروف ہیں۔ اس کا کی بورڈ چھ میٹر چوڑا اور ۴ میٹر اونچا ہے۔ ایک جاپانی "شین جیرو مٹسوئی" Shinjior Matsui نے اندھوں کے لئے ایک نیا الیکٹرک ٹائپ رائٹر بنایا ہے۔ یہ انگلش اور اندھوں کی زبان "برائلی" کو بیک وقت ٹائپ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور قسم کا الیکٹرانک ٹائپ رائٹر بنایا گیا ہے یہ ۱۸۰۰ حروف فی سیکنڈ ٹائپ کر سکتا ہے۔ ایک اور قسم کا ٹائپ رائٹر ۵۰ زبانوں میں ٹائپ کر سکتا ہے۔

۶۔ کیا انسان کو دوبارہ تعمیر کیا جا سکتا ہے؟

جس طرح انسان نے دوسرے شعبوں میں بے پناہ ترقی کی ہے اسی طرح طب کے میدان میں بھی بے پناہ ترقی کی گئی ہے۔ اب انسانی جسم کے مختلف حصے مصنوعی طور پر بنائے جا سکتے ہیں۔ اگر کسی شخص کی جلد جل جائے تو ڈاکٹر اس شخص کو نئی اور صحت مند جلد لگا دیتے ہیں وہ آنکھ کے بیمار یا خراب "کورنیا" کو نکال کر نئے ڈال سکتے ہیں۔ وہ انسان کو نیا خون دے سکتے ہیں۔ وہ پلاسٹک یا کسی دھات سے بازو اور ٹانگوں کی نئی ہڈیاں بنا سکتے ہیں۔ وہ نئے ناک، کان اور آنکھیں بھی بناتے ہی وہ پلاسٹک کے ہاتھ بنا سکتے ہیں۔ یہ ہاتھ بالکل اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ ان ہاتھوں کا رنگ بھی بالکل ایسا ہوتا ہے اور ان پر انگلیوں کے نشانات کے علاوہ بال بھی ہوتے ہیں۔

۷۔ کیا مشینیں انسان کی جگہ لے لیں گی؟

اسکاٹ لینڈ کی ایڈن برگ Edinburgh یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف مشین انٹیلی جینس نے ایک روبوٹ، فریڈی بنایا ہے۔ جاپان میں ہٹاچی لمیٹڈ نے بھی ایک روبوٹ بنایا ہے۔ یہ روبوٹ فریڈی کی نسبت بڑی تیزی سے کام کر سکتا ہے۔ امریکہ میں ڈلاس ایئرپورٹ میں الیکٹرک کاریں چلتی ہیں۔ یہ کاریں ڈرائیور کے بغیر چلتی ہیں۔

جاپان میں سنٹری لمیٹڈ نے ایک بیئر مشین بنائی ہے۔ یہ مشین بول بھی سکتی ہے۔ لوگ اس مشین میں پیسے ڈالتے ہیں اور یہ مشین ان کو بیئر کے ڈبے دیتی ہے۔ پھر یہ مشین کہتی ہے "تھینک یو"

انعامی لطیفہ

گداگروں کے متعلق یہ فرض کرلینا درست نہ ہوگا کہ سبھی فراڈ ہوتے ہیں۔ بعض کی مجبوریاں پیدائشی بھی ہوتی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ہی ایک لڑکا معصوم صورت گلے میں تختی لٹکائے آیا جس پہ لکھا تھا کہ "میں گونگا، بہرہ، یتیم ہوں۔ راہ مولا میری مدد کریں" ہم نے اسے روپیہ دیا اور چمکار کر پوچھا : "برخوردار کب سے گونگے بہرے ہو؟"

بولا : "جی پیدائشی ہوں۔"

مرسلہ : شارق عبداللہ، کراچی

ایک آدمی ہر خوشگوار بات پر تین مرتبہ ہنستا تھا۔ ایک دفعہ اس کے دوست نے کہا "یار تم ایک بات پر تین مرتبہ کیوں ہنستے ہو۔ اس نے جواب دیا "پہلی مرتبہ آپ کے ساتھ ہنستا ہوں۔ دوسری بار جب میں بات سمجھتا ہوں اور تیسری مرتبہ مجھے اپنی بے قوفی پر ہنسی آجاتی ہے۔

مرسلہ : رانا محمد شاہد، گلستان کالونی بورے والا

پولیس مین : (قیدی سے) معاف کرنا میں نے تمہیں چار دن زیادہ قید رکھا۔

قیدی : کوئی بات نہیں جب دوبارہ یہاں آؤں گا تو چار دن پہلے رہا کردینا۔

مرسلہ : رانا محمد شاہد، گلستان کالونی بورے والا

☆ --- ☆ --- ☆

ایک سکھ رات کے وقت موٹر سائیکل پر

جارہا تھا۔ اچانک ٹھنڈی ہوا چل پڑی تو اس نے رک کر اپنا کوٹ الٹا پہن لیا اور بٹن پیچھے کی طرف کرلیے اور موٹر سائیکل پر سوار ہوگیا۔ سردی سے بچنے کی اس نئی ترکیب پر وہ اتنا خوش تھا کہ ڈھلوان پر موٹر سائیکل پھسل گئی اور وہ دھڑام سے نیچے آرھا۔ کچھ دیر بعد بہت سے لوگ وہاں جمع ہوگئے۔ دیکھا کہ سردار صاحب مرے پڑے ہیں اور ایک سکھ ان کے قریب کھڑا ہے۔ اس سے لوگوں نے پوچھا "کیا ہوا ہے؟" وہ بولا : "جب میں پہنچا تو سردار جی کراہ رہے تھے۔ میں نے جھک کر دیکھا تو پتا چلا کہ گردن مڑگئی ہے۔ میں نے زور لگا کر گردن سیدھی کی تب سے نہیں بولے۔

مرسلہ : فاطمہ عارف، میمونہ عارف، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک افریقی آدم خور سردار پہلی بار بحری جہاز پر سفر کررہا تھا۔ جہاز کے عملے نے اس کو کھانے کی فہرست لاکر پیش کی۔

سردار نے فہرست کا جائزہ لیا۔ پھر سرہلا کر بولا :

"یہ فہرست میرے لئے بے کار ہے۔ تم میرے لئے جہاز کے مسافروں کی فہرست لاؤ!"

مرسلہ : سلیم الدین، کراچی۔

☆ --- ☆ --- ☆

پولیس کے محکمے میں انٹرویو ہورہا تھا۔ دو امیدوار انٹرویو کے لئے آفس میں گئے ان میں ایک پولیس آفیسر کا بیٹا تھا۔ آفس میں دونوں کو اکٹھا بلالیا گیا۔ پولیس آفیسر نے پہلے اپنے بیٹے سے پوچھا؟ "ہیر رانجھا کیا تھے؟" لڑکے نے جواب دیا اور اسے انٹرویو میں پاس کرلیا گیا۔

پولیس آفیسر نے دوسرے امیدوار سے پوچھا : "بتاؤ میں تم سے کیا سوال کروں؟"

امیدوار نے جواب دیا : صاحب جی! مجھ سے کوئی آسان سا سوال ہیر رانجھے کے متعلق پوچھ لیں؟"

پولیس آفیسر : "بتاؤ! ہیر رانجھے کے گھر کا ٹیلی فون نمبر کیا تھا۔"

مرسلہ : پرنس افضل شاہین، بہاولنگر

☆ --- ☆ --- ☆

اسلامیات کی کلاس میں ماسٹر صاحب نے بچوں کو تاکید کی کہ "دائیں ہاتھ سے کھانا پینا چاہئے اگر بائیں ہاتھ سے کھانا کھایا جائے تو شیطان ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوجاتا ہے۔"

سائنس کے پیریڈ میں دوسرے ماسٹر صاحب نے بچوں کو زیادہ میٹھا کھانے سے منع کیا اور تاکید کی زیادہ میٹھا کھانے سے شوگر ہوجاتی ہے۔ ایک بچے نے تمام باتیں غور سے سنیں۔ گھر گیا تو

کھانے کے وقت اس نے کسٹرڈ کو بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کیا تو باپ نے کہا۔
"بیٹا یہ کیا کر رہے ہو۔" بچے نے برجستہ کہا۔
"ابو شیطان کو شوگر کر رہا ہوں۔"

مرسلہ : سائرہ سلطان، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

سڑک پر ایک پتھر پڑا تھا۔ جس پر لکھا تھا جس شخص کو قسمت آزمائی کرنی ہو وہ پتھر اٹھا کر نیچے دیکھے۔
ایک آدمی نے پتھر اٹھایا تو نیچے لکھا تھا "پتھر واپس رکھ دو ابھی تم جیسے پاگل اور بھی آئیں گے۔"

مرسلہ : شیخ علی رضا قمر، پتوکی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک آدمی اپنے نجومی دوست کے پاس گیا اور اس سے پوچھا؟
"آج میں جس مقصد کے لئے گھر سے نکلا ہوں کیا وہ پورا ہو جائے گا؟" نجومی بولا "ہاں بالکل سو فیصد آج تمہارے لئے بڑا مبارک دن ہے۔"
دوست بولا "تو پھر نکالو پانچ سو روپے مجھے سخت ضرورت ہے۔"

مرسلہ : محمد اختر سردار کسووال

☆ --- ☆ --- ☆

مرزا صاحب شطرنج کے رسیا تھے۔ ایک روز دوستوں کی محفل میں ایسی بازی لگی کہ تمام رات شطرنج کی نذر ہو گئی اور صبح پانچ بجے واپس گھر واپس آئے تو بیگم نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا "اب کیا کرنے آگئے۔" تو مرزا جی نے معصومیت سے جواب دیا۔ "ناشتہ کرنے۔"

مرسلہ : کامران خان طالب، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

"میں ایک ایسے فوٹو گرافر سے واقف ہوں جسے پورٹریٹ اتارنے میں مہارت حاصل تھی آج کل وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے عجائب گھر سے کئی پورٹریٹ اتار لئے تھے۔"

مرسلہ : محمد سعید علوی، چکوال

☆ --- ☆ --- ☆

پھل فروش نے ایک چھوٹے سے آم کی قیمت نو روپے پچھتر پیسے طلب کی تو خریدار کو بڑی حیرت ہوئی۔ جیسے تیسے اس نے حیرت پر قابو پایا۔ جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر دکان دار کو دیا اور باہر جانے لگا۔ تو دکان دار نے آواز دی۔
"جناب، پچھتر پیسے تو لیتے جایئے۔"
خریدار نے کہا "رہنے دیں آپ کی دکان میں داخل ہوتے وقت میرے پاؤں تلے ایک انگور کا دانہ آگیا تھا۔"

مرسلہ : ارشد نواز، کوہاٹ

☆ --- ☆ --- ☆

ایک مرتبہ روس کے سابق وزیر اعظم

خروشیف ایک بہت بڑے مجمع سے خطاب کررہے تھے اور موضوع تھا "اسٹالن"۔ خروشیف اسٹالن پر تند و تیز تنقید کرتے رہے اور اس کے ظلم و جبر اور زیادتی کی ایسی ایسی داستانیں سنائیں کہ مجمع دم بخود سنتا رہا، مجمع میں سے کسی نے ایک چھوٹے سے پرزے پر لکھا۔ "جب یہ سارے مظالم ہو رہے تھے اس وقت آپ کہاں تھے؟ آپ نے اس ظلم کے خلاف کیا کیا؟"

یہ پرزہ خروشیف تک پہنچ گیا، خروشیف نے اسے پڑھا اور تھوڑی دیر خاموش رہا پھر ڈانٹ کر پوچھا "جن صاحب نے یہ سوال کیا ہے، وہ کھڑے ہو جائیں۔"

اعتراض کرنے والا خاموش رہا اور بیٹھا رہا۔

خروشیف نے پھر کہا "صاحبِ سوال کھڑا ہو جائے۔"

معترض پھر خاموش رہا۔

خروشیف نے جواب دیا۔ "اسٹالن کے ظلم و ستم کے دور میں، میں بھی یہی کرتا تھا۔"

مرسلہ : عبدالباسط، ہری پور

☆ --- ☆ --- ☆

ملا نصیرالدین سے کسی نے پوچھا "پستے کا حلوہ مزیدار ہوتا ہے یا بادام کا؟"......ملا نے جواب دیا۔ "معاملہ انصاف کا ہے، میں فریقین کی عدم موجودگی میں فیصلہ نہیں کرسکتا۔ دونوں کو حاضر کرو، تو فوراً" بتادوں گا۔"

آنکھ مچولی کے پرانے شمارے کیسے منگوائیں؟

ہمیں قارئین کے ایسے بہت سے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں جن میں وہ آنکھ مچولی کے پرانے شمارے منگوانے کا طریقہ کار دریافت کرتے ہیں۔ اگر آپ آنکھ مچولی کے پرانے شمارے منگوانا چاہتے ہیں تو ان شماروں کی تفصیل، نصف قیمت کا منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتا ہمیں روانہ کردیجیے۔ ہم پرچے آپ کو بھجوادیں گے۔

خط و کتابت کے لیے پتا:

منیجر سرکولیشن، ماہنامہ آنکھ مچولی I - پی آئی بی کالونی کراچی ۵ فون: ۴۹۴۲۸۵۷ ۴۹۴۸۲۱۰

جیتے گا پھر پاکستان

منوّر احمد صدّیقی، کراچی

گونجے کرکٹ کا میدان
میاں داد بنے کپتان
جیتے گا پھر پاکستان
یہ ہے ایسا ایک کھلاڑی
ہرگز جو نہ گھبرائے
داؤ لگائے عمدہ سا
دشواری جب پیش آئے
کر دے دنیا کو حیران
میاں داد بنے کپتان
جیتے گا پھر پاکستان
مدِ مقابل ہو کوئی
افریقہ یا انگلستان
لائیں گے ہم کپ پر کپ
سب کو کر دیں گے حیران
بڑھ جائے گی اپنی شان
میاں داد بنے کپتان
جیتے گا پھر پاکستان
ٹیم اگر ہو مشکل میں
گھبراہٹ بھی طاری ہو
مدِ مقابل ہو عمدہ
پلّا اس کا بھاری ہو
پھر بھی اپنا ہے ایمان
اونچی ہوگی اپنی شان
میاں داد بنے کپتان
جیتے گا پھر پاکستان

آخری کھلاڑی

محمد عمر اجمل خان

اسٹیڈیم پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ آخری کھلاڑی ہرگیند روک کر کھیل رہا تھا۔ دس اوور میں صرف بیس رنز بنے تھے اور پانچ بہترین کھلاڑی آؤٹ ہو کر پویلین میں جا بیٹھے تھے۔

وقت کی نبضیں دھیمی چل رہی تھیں اور شائقین کے دل کی دھڑکنیں جیسے رُک گئی تھیں۔ ایک یقینی شکست سامنے نظر آرہی تھی لیکن سب سوچ رہے تھے۔ "آخری کھلاڑی جب تک وکٹ پر موجود ہے شکست نہیں ہو سکتی۔"

آخری کھلاڑی کیا سوچ رہا تھا' یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔ "دو سو نوے رنز" ان کی ٹیم کی منزل تھے اور منزل کتنی دور ہے؟ یہ سوچ سوچ کر وہ پریشان ہو رہا تھا۔

دُنیائے کرکٹ کے سب سے بڑے ٹورنامنٹ کا فائنل تھا۔ مخالف ٹیم نے پہلے بیٹنگ کرتے ہوئے نو کھلاڑیوں کے نقصان پر مقررہ

اوورز میں دو سو نواسی رنز بنائے تھے اور چیمپئن ٹیم کو میچ جیتنے کے لئے دو سو نوے کا ٹارگٹ دیا تھا۔

دو سو نوے رنز مشکل ضرور تھے ناممکن نہیں لیکن اب پانچ بہترین کھلاڑیوں کے آؤٹ ہونے کے بعد بالکل ناممکن نظر آرہے تھے۔

کمینٹیٹر چیخ رہا تھا۔ "اکیس رنز گیارہ اوور کے اختتام پر پانچ مستند بلے باز آؤٹ..... چیمپئن ٹیم سخت مُشکلات کا شکار..... کیا چیمپئن ٹیم ہار جائے گی لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا..... کرکٹ میں کوئی بھی بات یقینی نہیں۔ ٹیم کی آخری اُمید آخری کھلاڑی سے وابستہ جنہوں نے تمام میچوں میں بہترین کھیل پیش کیا ہے لیکن اس وقت وہ بھی بے حد سست کھیل رہے ہیں۔" گیارہویں اوور میں آخری کھلاڑی ایک فیصلہ کرچکا تھا پھر جیسے ہی بارہواں اوور شروع ہوا تو نہ صرف کمینٹیٹر بلکہ تمام شائقین چیخ پڑے۔ اسٹیڈیم تالیوں سیٹیوں اور پُرجوش نعروں سے گونج اُٹھا۔ زندگی کی رونق جیسے لوٹ آئی۔ آخری کھلاڑی نے بڑے ہی جارحانہ انداز سے پہلی گیند پر چھکا لگا کر مخالف ٹیم کے دباؤ کو کم کرنے کی کوشش کی اور اس کے بعد دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں گیندوں پر مسلسل چار چوکے لگا کر اسٹیڈیم میں زندگی کی لہر دوڑادی۔ چھٹی گیند پر اس نے دوڑ کر صرف ایک رن لیا۔ نئے بالر کا بھی وہ خود ہی سامنا کرنا چاہتا تھا۔

اب چھکے چوکے پڑ رہے تھے۔ آخری کھلاڑی کا بلّا رنزوں کا ڈھیر لگا رہا تھا۔ صرف تین اوور میں اس کی ففٹی مکمل ہوئی تھی۔ اس کی طوفانی بیٹنگ مخالف ٹیم کے کیمپ میں خطرے کا سائرن بجا رہی تھی اور جب چھتیس گیندوں کا اختتام ہوا تو اسکرین پر مُبارک باد کے الفاظ اس کی جارحانہ سنچری کو خراجِ تحسین پیش کررہے تھے..... پورا اسٹیڈیم تالیوں اور پرجوش نعروں سے گونج رہا تھا۔ لوگ آخری کھلاڑی کی رنگین تصویریں اُٹھائے ناچ رہے تھے۔ کمینٹیٹر چیخ رہا تھا۔

"صرف چھتیس گیندوں میں سو رنز..... یقین نہیں آتا.....!!"

تیس اوور کے اختتام پر پانچ ہی کھلاڑی آؤٹ تھے اور اسکور دو سو رنز پر پہنچ گیا تھا آخری کھلاڑی زیادہ تر خود ہی بالنگ کا سامنا کررہا تھا۔ جب اس کے ساتھی کی بیٹنگ کی باری آتی تو وہ دوسرے اینڈ پر جاکر اسے بار بار سمجھاتا۔ "دیکھو! روک کر کھیلنا..... شاٹ نہیں مارنا..... میں تمہارے ساتھ ہی جیت کر پویلین تک جانا چاہتا ہوں۔"

جو پانچ سینئر کھلاڑی آؤٹ ہو کر گئے تھے ان

نے بھی اس نے یہی کہا تھا اور انہوں نے تقریباً ملتے جلتے جواب دیئے تھے۔ کسی نے کہا تھا۔ "اپنا لیکچر اپنے پاس رکھو۔۔۔" "کیا ہمیں کھیلنا نہیں آتا؟۔۔۔" "اتنی آسان وکٹ پر روک کر کھیلنا تو بزدلی ہے" "تم سے اچھے شاٹ ہم کھیلتے ہیں۔۔۔۔۔!!" وکٹ واقعی آسان تھی لیکن حد سے زیادہ خود اعتمادی اور بے صبرا پن پانچوں کھلاڑیوں کو لے ڈوبا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ۔۔۔۔۔ چیمپئن ٹیم متحد نہیں تھی۔ آخری کھلاڑی نے اپنی مؤثر گفتگو سے 'کوششوں سے کھلاڑیوں کے اختلافات کم کرا دیئے تھے' کپتان کے ساتھ مل کر نئی حکمت عملی ترتیب دی تھی جس کی وجہ سے ٹیم گرتی پڑتی فائنل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن فائنل میں اختلافات حکم عدولی اور نااتفاقی بڑھ گئی تھی۔

بتیسواں اوور شروع ہوا تو آخری کھلاڑی کے ساتھی نے بھی مار دھاڑ شروع کر دی۔ "کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔ سنبھل کر کھیلو۔" آخری کھلاڑی نے اسے سمجھایا۔ لیکن وہ سنبھل کر کھیل نہ سکا اور پانچویں گیند پر آؤٹ ہو گیا۔

"میں نے کہا تھا ناں سنبھل کر کھیلنا لیکن تم۔۔۔۔۔ چلو کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔۔ دل چھوٹا نہ کرنا۔۔۔ شاباش۔۔۔ تم نے میرا بہت ساتھ دیا!!"

آٹھواں کھلاڑی کھیلنے آیا تو آخری کھلاڑی نے اسے بھی سمجھایا۔ "وکٹ بہت آسان ہے تم آخری اوور تک اس پر کھیل سکتے ہو لیکن مارنا نہیں صرف روک کر کھیلنا۔"

"اچھا ٹھیک ہے ٹھیک ہے!!" آٹھویں کھلاڑی نے بڑی نخوت سے جواب دیا۔ وہ آخری کھلاڑی کو پسند نہیں کرتا تھا۔

پہلی ہی گیند پر اس نے ایک زوردار چھکا مارا۔ "کیا کر رہے ہو۔۔۔۔ مارو نہیں وکٹ بچاؤ۔" آخری کھلاڑی چیخا۔

"مجھے کھیلنے دو۔۔۔۔ ڈراؤ مت۔۔۔۔۔ وکٹ بہت آسان ہے۔"

آٹھویں کھلاڑی نے بڑے غرور سے کہا پھر وکٹوں سے باہر جاتی ہوئی ایک گیند کو کٹ کرنے کی کوشش کی اوور اپنی وکٹ سیکنڈ سلپ میں کھو بیٹھا۔

"میں نے کہا تھا نا روک کر کھیلو لیکن تم۔۔۔ تم نے سارے میچ کا ستیاناس مار دیا۔۔۔۔ مجھے تمہاری ضرورت تھی!!" نواں کھلاڑی بالر تھا، بلا بھی ٹھیک سے پکڑنا نہیں آتا تھا لیکن اس نے کسی منجھے ہوئے بلے باز کی طرح بالنگ کا سامنا کیا اور تمام گیندیں روک کر کھیل لیں۔ اسٹیڈیم تالیوں سے گونج اٹھا۔ آخری کھلاڑی نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ "شاباش! اسی طرح کھیلنا مجھے تمہاری پارٹنر شپ کی ضرورت ہے۔" نیا اوور شروع ہوا

تو رنز کی بارش ہونے لگی۔ اسکور بورڈ پر اسکور تیزی سے بڑھنے لگا۔

"کمینٹیٹر چیخ رہا تھا "اس اوور میں چار چھکے لگے ہیں......شاندار بیٹنگ.....ایسی شاندار اور ذمہ دارانہ بیٹنگ شائقین مدتوں فراموش نہ کرسکیں گے۔ چیمپئن ٹیم کا فتح کی جانب بڑھتا ہوا اسکور دو سو ساٹھ رنز..... فتح کی منزل بالکل قریب..... صرف تیس رنز درکار اس فائنل میچ کو جیتنے کے لئے.....ایک دلچسپ بات اور...... آخری کھلاڑی اگر بیس رنز بنانے میں کامیاب ہوگئے تو ون ڈے میچوں میں کسی کھلاڑی کی یہ پہلی ڈبل سنچری ہوگی..... جس طوفانی انداز میں وہ بیٹنگ کررہے ہیں اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ڈبل سنچری بنالیں گے بلکہ اپنی ٹیم کو ایک شاندار فتح سے ہمکنار کریں گے۔ کیپل دیو کا ریکارڈ ٹوٹنے کے بعد اب ویوین رچرڈز کا ایک سو نواسی رنز کا ریکارڈ خطرے میں!!"

چار اوور باقی رہ گئے تھے۔ چوبیس گیندوں میں اب صرف تیس رنز درکار تھے اور سب کو یقین ہوگیا تھا کہ اب چیمپئن ٹیم میچ جیت جائے گی۔ ۴۷ ویں اوور کا کھیل شروع ہوا تو آخری کھلاڑی نے تین شاندار چھکے مارے پھر ایک خطرناک رن لیا۔ فیلڈر نے پھرتی سے گیند تھرو کی اور وکٹ کیپر نے آناً فاناً بیلز اڑا دیں

"آؤ......ؤ.....ؤ.......ؤ.......ٹ!!"

تمام کھلاڑی چیخ اٹھے اور چیختے ہوئے اسٹیڈیم میں جیسے موت کی خاموشی چھاگئی۔ آخری کھلاڑی کریز میں گرا ہوا تھا۔ اور دونوں ایمپائر ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ فیصلہ مُشکل ہوگیا تھا۔

"کیا آخری کھلاڑی آؤٹ ہوچکا ہے؟"

سب دھڑکتے دلوں کے ساتھ سوچ رہے تھے۔ ری پلے اسکرین پر بار بار دکھایا جارہا تھا۔ لوگوں کے اعصاب تن گئے تھے۔ ری پلے دیکھنے کے بعد تیسرے ایمپائر نے فیصلہ آخری کھلاڑی کے حق میں دیا۔ مخالف ٹیم میں مایوسی جبکہ اسٹیڈیم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ چیخ وپکار اتنی تھی کہ کان پڑی سنائی نہ دیتی تھی۔ تماشائی خوش تھے لیکن آخری کھلاڑی سخت تکلیف میں تھا۔ کریز میں پہنچنے کی کوشش میں وہ بُری طرح گرا تھا اور اس کی پنڈلی درد کی بے پناہ ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کھڑا بھی نہ ہوسکے گا۔ اس نے اپنی پنڈلی کا جائزہ لیا۔ وہ جگہ بُری طرح سوج رہی تھی۔ "اُف میرے خدا! ہڈّی ٹوٹ چکی ہے۔ اگر میں ریٹائر ہوکر پویلین میں واپس چلا گیا تو ہم جیتا ہوا میچ ہار جائیں گے۔" اس نے گردن اُٹھا کر میدان میں لہراتے ہوئے سبز ہلالی پرچم کو دیکھا پھر سوچا۔ "میری کریز میں موجودگی دوسرے کھلاڑیوں کو حوصلے بخشے گی صرف تین اوور ر

گئے ہیں..... میں نہیں جاؤں گا..... ایک ٹانگ سے کھیلوں گا۔" اپنی چیخیں دباتے ہوئے آخری کھلاڑی نے ایک مضبوط فیصلہ کرلیا۔ ۴۸ ویں اوور کی آخری دو گیندیں اس نے لنگڑاتے ہوئے بڑی تکلیف کے عالم میں روک کر کھیلیں۔

کمنٹیٹر کہہ رہا تھا : "معاملہ کچھ گڑبڑ ہے شائد چوٹ زور دار لگی ہے؟" چمپئن ٹیم کا ڈاکٹر اور کوچ بھاگتے ہوئے آخری کھلاڑی کی طرف جارہے تھے۔ ٹی وی پر دکھایا جارہا تھا ڈاکٹر آخری کھلاڑی کا معائنہ کرنے کے بعد تشویش سے کچھ کہہ رہا ہے اور آخری کھلاڑی بار بار نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

میچ دوبارہ شروع ہوا تو آخری کھلاڑی کی مدد کے لئے ایک رنر آگیا۔ آخری کھلاڑی گیندیں روکنے لگا میچ پھر سُست پڑ گیا۔ تماشائیوں میں بے چینی اور مایوسی پھیلنے لگی آٹھ گیندیں باقی رہ گئی تھیں اور میچ جیتنے کے لئے اب نو رنز درکار تھے۔ آخری کھلاڑی لنگڑا لنگڑا کر کھیل رہا تھا اور بے حد سُست کھیل رہا تھا۔ اسٹیڈیم پر ایک بار پھر سناٹا طاری ہوگیا تھا۔ اس کا ایک رن بنا تو اسٹیڈیم شور، چیخ و پکار اور نعروں سے دوبارہ گونج اُٹھا۔ آخری کھلاڑی نے ون ڈے میچوں میں دو سو رنز بنا کر نیا عالمی ریکارڈ قائم کردیا تھا۔

چمپئن ٹیم فتح کے بالکل قریب پہنچ گئی تھی سب بے حد خوش تھے سات گیندوں میں اب سات رنز درکار تھے۔ فتح کی منزل قریب تھی لیکن پھر اک دم سے کھیل کا پانسا پلٹ گیا۔ یکے بعد دیگرے آخری کھلاڑی کے ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور آؤٹ ہوتے چلے گئے۔

جیسے ہی چمپئن ٹیم کا دسواں کھلاڑی آؤٹ ہوا، آخری کھلاڑی زمین پر گر گیا۔ وہ بچّوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہا تھا۔ ان کی ٹیم اس کی شاندار پرفارمنس کے باوجود صرف آٹھ رنز سے ہار گئی تھی۔ تماشائی رو رہے تھے۔ کمنٹیٹر بھی رو رہا تھا اور چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ "آخری کھلاڑی کی پنڈلی کی ہڈّی دو جگہ سے ٹُوٹ چکی ہے۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے کریز نہیں چھوڑی وہ پہلے نمبر پر کھیلنے آئے تھے اور آخری وقت تک ٹانگ ٹوٹنے کے باوجود اپنی ٹیم کو جتوانے کے لئے کھیلتے رہے۔"

"وہ عظیم کھلاڑی ہیں۔ ان جیسا کھلاڑی اب شائد کبھی پیدا نہ ہو۔" کمنٹیٹر سے بولا نہیں جارہا تھا۔ شائد آنسوؤں کا پھندا اس کے گلے میں پڑ گیا تھا۔

آخری کھلاڑی کو اسٹریچر پر ڈال کر گراؤنڈ سے باہر لایا جانے لگا تو سارے شائقین کھڑے ہو کر اسے زبردست خراجِ تحسین پیش کرنے لگے۔ اس کے اسٹریچر کو چاروں طرف سے اس

کے کھلاڑیوں نے تھام رکھا تھا اور سب رو رہے تھے۔

تماشائی افسُردہ تھے اور آہستہ آہستہ سبز ہلالی پرچم لہرا رہے تھے۔ میدان کے اوپر لگا بڑا سا سبز پرچم بھی دھیمے دھیمے لہرا کر کھلاڑی کی بیٹنگ کی عظمتوں کو خراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔ آخری کھلاڑی اسٹریچر پر پڑا تکلیف بھول کر رو رہا تھا اور سوچ رہا تھا :

"کاش! میرے دو سو رن کا ریکارڈ نہ بنتا بس صرف چار رن بن جاتے کاش! کچھ کھلاڑی میرا ساتھ دے دیتے۔ کاش! کھلاڑیوں میں نااتفاقی اور اختلافات نہ ہوتے صرف چار رن اور بن جاتے..... صرف چار رن اور.....!!"

آخری کھلاڑی نے آنسوؤں میں بھیگی آنکھوں کے درمیان بڑی افسردگی سے دیکھا۔ اس کے سارے ساتھی اس کے قریب تھے' اس کے بالکل قریب' شرمندہ' افسردہ' آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے لیکن ان سب کی آنکھوں میں ایک تیز چمک تھی۔ وہ ایک نظر آرہے تھے..... تب آخری کھلاڑی نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اب اسے ہارنے کا غم نہیں تھا۔ "ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے۔ ٹیمیں کھلاڑیوں کے انفرادی کھیل سے نہیں آپس کے اتحاد سے جیتتی ہیں۔" اس نے سوچا اور اطمینان و خوشی سے اپنے کھلاڑیوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہاں اتحاد کا نیا سورج جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔

جانے والی ہار ایک آنے والی جیت ان کھلاڑیوں کے چہروں پر لکھ رہی تھی!!

متوازن غذا
صحت کی ضامن

ماہرین غذائیت غذاؤں کو درج ذیل چار حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں

- سبزیاں، پھل اور فروٹ
- اناج، چاول، گندم اور دالیں وغیرہ
- دُودھ، مکھن، گھی، پنیر اور دہی وغیرہ
- گوشت، انڈے، مُرغی اور مچھلی وغیرہ

اگر آپ نے دن بھر کی غذاؤں میں ان چاروں حصّوں سے کچھ نہ کچھ کھا لیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے متوازن غذا کھالی اور آپ کے جسم کو مطلوبہ توانائی میسر آگئی۔

اشتہار برائے ترغیب حفظانِ صحت و تندرستیٔ اطفال - آنکھ مچولی

اور پاکستان... جیت گیا

پانچویں ورلڈ کپ کرکٹ کی سنسنی خیز کہانی

عائشہ محبوب

جاوید میانداد ہمیشہ کرکٹ کے ناخداؤں کے عتاب کا شکار رہے۔ انہیں اچھے کھیل کے باوجود ٹیم سے بار بار نکالا گیا۔ سب سے زیادہ سنچریاں اور سب سے زیادہ رنز کے ریکارڈ سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے باوجود انہوں نے ملک و قوم کے لئے ہمیشہ اعلیٰ کھیل کا مظاہرہ کیا۔

۱۸ گیندوں میں طوفانی ۳۳ رنز اور تین وکٹیں فائنل کے "مین آف دی میچ" وسیم اکرم

ہم ہار رہے تھے اور بہت بُرا کھیل رہے تھے پھر اللہ نے مدد کی ہم جیت گئے... مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا!!

دنیائے کرکٹ کا سب سے بڑا ٹورنامنٹ اور شائقین کرکٹ کی رنگا رنگ دلچسپیوں اور دھڑکنوں کا محور چھٹا ورلڈ کپ ۱۴ فروری ۱۹۹۶ء سے پاکستان، سری لنکا اور بھارت میں مشترکہ منعقد ہو رہا ہے۔

ورلڈ کپ ہر چار سال بعد منعقد ہوتا ہے۔ اب تک اس سلسلے کے پانچ ٹورنامنٹ ہو چکے

ہیں۔ جن میں سے تین انگلستان میں، ایک بھارت اور پاکستان میں جبکہ ایک آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں مشترکہ منعقد ہوا۔ پہلے دو ورلڈ کپ دنیا کی فائٹر ٹیم ویسٹ انڈیز نے اپنے شاندار کھیل کی بدولت حاصل کئے جبکہ تیسرا ورلڈ کپ ہمارے پڑوسی ملک بھارت نے اپنے کھلاڑیوں کی ٹیم اسپرٹ، نظم وضبط اور اعلیٰ کھیل سے جیتا۔ چوتھے کپ کی مشترکہ میزبانی بھارت اور پاکستان کے حصے میں آئی تھی اور اس ورلڈ کپ میں ان دونوں ٹیموں نے نہایت شاندار کھیل کا مظاہرہ

ہم پہلی ہی بار ورلڈ کپ میں آئے اور کھیل پر چھا گئے۔
کیپلر ویسلز

کرتے ہوئے سیمی فائنل تک رسائی حاصل کی۔ لیکن حد سے زیادہ خود اعتمادی اور تھوڑا سا غرور انہیں لے ڈوبا اور ان دونوں ٹیموں کو ان کے سیمی فائنلز میں اپنے ملک اور اپنے ہی شائقینِ کرکٹ کے درمیان عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ چوتھا ورلڈ کپ انتھک محنت، عمدہ کھیل اور اعلیٰ نظم وضبط سے سے آسٹریلیا نے حاصل کیا۔ پھر پانچواں ورلڈ کپ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں مشترکہ منعقد ہوا جس میں تمام ہی

بھارتی ٹیم کے کپتان اور مستند بلے باز مسلمان
کھلاڑی محمد اظہر الدین

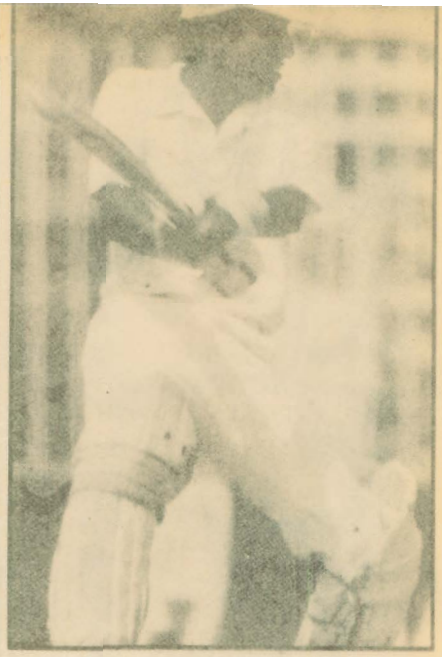

روک کر کھیلنا مجھے نہیں آتا .... سعید انور

ٹیموں نے عمدہ کھیل پیش کیا لیکن سب سے مایوس کُن کارکردگی پاکستان کی تھی۔ پاکستان اپنا پہلا میچ ویسٹ انڈیز سے دس وکٹوں سے ہار گیا۔ اس کے بعد نسبتاً کچھ نوجوان کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم زمبابوے سے دوسرا میچ ۵۳ رنز سے جیت لیا پھر انگلینڈ کے خلاف ایک ہارا ہوا میچ برابر ہوا جس کی وجہ سے ایک قیمتی پوائنٹ ملا۔ ۱۴ مارچ کو ایک نقصان اور اُٹھانا پڑا جب محمد اظہر الدین کی قیادت میں آئی ہوئی بھارتی ٹیم نے پاکستانی کھلاڑیوں کے چھکے چھڑا دیئے اور ۴۳ رنز سے پاکستان یہ میچ ہار گیا۔ ایک اور صدمہ اس وقت اُٹھانا پڑا۔ جب جنوبی افریقہ کی کرکٹ ٹیم کے اُفق پر اُبھرنے والے نوجوان اور پُر جوش کھلاڑیوں نے پاکستان کو ہرا دیا۔ پاکستان نے پانچ میچ کھیل کر صرف تین پوائنٹ حاصل کئے تھے اور اس کی مایوس کُن کارکردگی سامنے آئی تھی اب اس کے تین میچ باقی رہ گئے تھے اور سیمی فائنل میں پہنچنے کا خواب معدوم ہو چلا تھا۔

کرکٹ کے ناقدین اور ماہرین اس کارکردگی پر سخت تنقید کر رہے تھے۔ سخت دباؤ تھا اور ٹیم بے حد مشکل میں تھی لیکن پھر تمام کھلاڑیوں نے فیصلہ کیا کہ ہم مل کر کھیلیں گے اور آخری گیند تک لڑیں گے۔ یہ فیصلہ ہو گیا تو سارے کھلاڑی ایک لڑی میں بندھ گئے اور میدان میں ڈٹ گئے۔ پہلے آسٹریلیا کو ۴۸ رنز سے شکست دی گئی پھر سری لنکا کو چار وکٹوں سے اُکھاڑ پھینکا گیا اور پھر مسلسل جیتنے والی بہترین کیوی ٹیم نیوزی لینڈ کو اس

ایک کھلاڑی کی رسوائی پورے پاکستان کی رسوائی

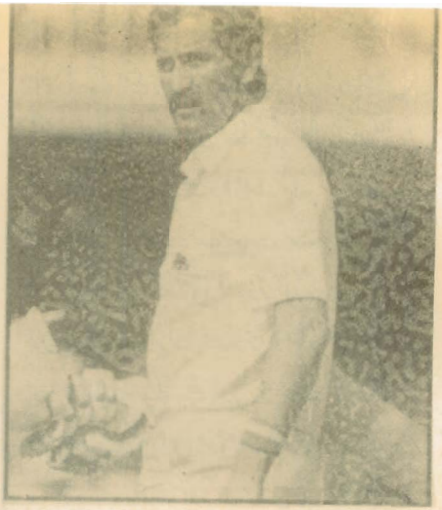

گراہم کوچ آؤٹ ہونے کے بعد بے حد مایوس

گواسکر نے کہا۔

"اب پاکستانی کھلاڑی متحد ہیں اب وہ نئے چیمپئن بن سکیں گے۔" گواسکر نے کتنی اچھی بات کہی تھی۔ سچ ہے کہ ٹیم کے کھلاڑی آپس میں ایک ہوں ان میں کوئی اختلاف نہ ہوں اور وہ صرف اور صرف اپنے وطن اور اپنی قوم کے لئے کھیلے تو انہیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

پاکستان نے سیمی فائنل میں نہایت عمدہ کھیل پیش کیا۔ نیوزی لینڈ کو پہلے بیٹنگ ملی تھی۔ اس نے ایک اچھا اسکور کیا اور ۲۶۲ رنز بنا کر پاکستان کو ۲۶۳ رنز کا ٹارگٹ دیا۔ یہ ناممکن اسکور تو نہ تھا لیکن اتنا آسان بھی نہ تھا۔

پاکستانی کھلاڑیوں نے اللہ کا نام لے کر کھیل کا آغاز کیا۔ رمیز راجہ' انضمام' جاوید میانداد اور

میں نے تو بہت کوشش کی لیکن پاکستانی باؤلروں نے چلنے ہی نہ دی بھلا میں کیا کرتا.... این لیمب

کے ہی گراؤنڈ اور شائقینِ کرکٹ کے سامنے پاکستانی ٹیم نے سات وکٹوں سے ڈھیر کردیا۔ لیکن سیمی فائنل کا خواب ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ اگر آسٹریلیا ویسٹ انڈیز کو شکست دے دیتا تو تب پاکستان کے سیمی فائنل میں پہنچنے کے چانس تھے۔ ویسٹ انڈیز اور آسٹریلیا کا میچ ہوا تو سب کی دلچسپیاں اس میچ میں لگ گئیں۔ ویسٹ انڈیز پورا زور لگا رہا تھا کہ یہ میچ جیتے ادھر آسٹریلیا بھی جیتنے کے لئے میدان میں اُترا تھا۔ پاکستان کے عوام دُعا مانگ رہے تھے کہ آسٹریلیا میچ جیت جائے پھر دُعائیں قبول ہوگئیں اور آسٹریلیا یہ میچ جیت گیا' پاکستان سیمی فائنل میں پہنچ گیا۔

پاکستان نے جب نیوزی لینڈ کو ہرایا تھا تو تب کرکٹ کے شہرہ آفاق بھارتی کھلاڑی سنیل

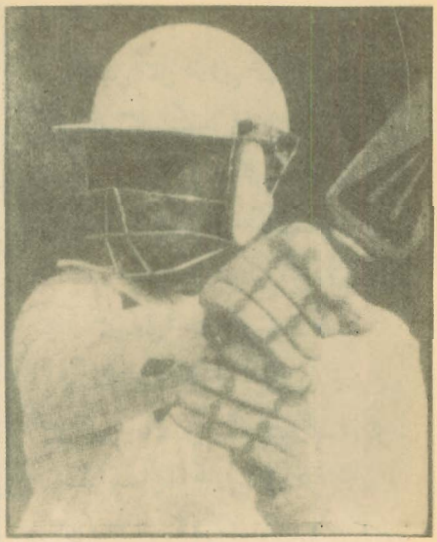

گراہم ہک نے بہت ہک شاٹ کھیلے مگر۔۔۔۔!!"

وکٹ کیپر معین نے نہایت شاندار کھیل پیش کیا۔ رمیز کی عمدہ سنچری' انضمام کے جارحانہ ساٹھ رنز کی اننگز اور میانداد کے وکٹ پر ٹھہرے رہنے کے پرسکون ستاون رنز پاکستان کو جیت کے قریب لے گئے۔ پھر معین نے مسلسل دو گیندوں پر لگاتار ایک چھکا اور ایک چوکا مار کر پاکستان کو فائنل میں پہنچادیا۔

۲۵ مارچ ۱۹۹۲ء کا دن اُمیدوں اور شکوک و شبہات لئے شائقین کرکٹ اور پاکستان کے سامنے جلوہ گر ہوا۔ انگلینڈ کی مضبوط ٹیم فائنل میں مدِمقابل تھی۔ پاکستان کی پہلے باری آئی۔ کھیل شروع ہوا تو پاکستان کے دونوں ابتدائی کھلاڑی ۲۴ رنز کے اسکور پر آؤٹ ہوگئے اور ٹیم دباؤ میں آگئی۔ میانداد اور عمران نے صورتحال کے پیش نظر اگلے نمبروں پر کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ میانداد نے طبیعت خراب ہونے کے باوجود وکٹ پر ٹھہرنے کا عزم کیا۔ ان کے قیمتی ۵۸ رنز اور کپتان عمران خان کے ذمّہ دارانہ ۷۲ رنز حوصلہ افزا تھے۔ اوورز کافی ہوچکے تھے اور رنز بنانے کی رفتار خاصی سُست تھی اس موقع پر عمران اور میانداد بدقسمتی سے آؤٹ ہوگئے۔ لیکن پھر وسیم اکرم اور انضمام نے انگلینڈ کے باؤلروں کے چھکے چُھڑا دیئے۔ انضمام نے ۳۵ گیندوں پر ۴۲ رنز اور وسیم اکرم نے صرف اٹھارہ گیندوں پر ۳۳ رنز بنا ڈالے۔ پاکستان نے مقررہ اوورز میں ۲۴۹ رنز بنائے اور انگلینڈ کو میچ جیتنے کے لئے ۲۵۰ رنز کا

مشتاق نے پہلے گراہم ہک اور پھر کپتان گراہم کوچ کی اہم وکٹیں لے کر سنسنی پھیلادی۔

ٹارگٹ دیا۔

انگلینڈ نے کھیل شروع کیا تو اس کا آغاز اچھا نہ تھا۔ بوتھم اور اسٹیورٹ بالترتیب صفر اور سات رنز پر آؤٹ ہوگئے۔ اس کے بعد گراہم ہک مشتاق کی ایل بی ڈبلیو کا شکار ہوئے۔ انہوں نے ۳۶ گیندوں پر صرف ۱۷ رنز بنائے۔ مشتاق نے اس میچ میں بڑی نپی تلی بولنگ کی پھر اپنے اگلے ہی اوور میں انہوں نے انگلینڈ کی ٹیم کے مانے ہوئے بیٹسمین اور بہترین کپتان گراہم گوچ کو عاقب جاوید کے ہاتھوں آؤٹ کرادیا۔ اب انگلینڈ سخت مشکل میں پھنس چکا تھا۔ ۶۹ رنز پر اس کے چار بہترین کھلاڑی پویلین سدھار چکے تھے لیکن پھر نئے آنے والے تجربے کار بیٹسمین ایلن لیمب اور نیل فیئر برادرز نے اپنی ٹیم کو سہارا دیا اور پینتیسویں اوورز تک اسکور ۱۴۱ رنز تک پہنچادیا۔ اس موقع پر یوں لگ رہا تھا جیسے میچ پاکستان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے لیکن پھر پاکستان کے ہونہار بولر وسیم اکرم نے اپنی تیز اور تباہ کن بولنگ کا جادو جگایا۔ انہوں نے پہلے انگلینڈ کے تجربے کار کھلاڑی ایلن لیمب کی وکٹ اُکھاڑی اس کے فوراً بعد دوسری ہی گیند میں نئے آنے والے کرس لوئس کو بولڈ کردیا۔ ۴۳ ویں اوور میں عاقب جاوید نے نیل فیئر برادرز کی وکٹ لیکر ایک اور خطرہ دور کردیا۔ نیل نے ۷۲ گیندوں پر ۶۲ رنز بنائے۔ بعد میں آنے والے

نیل فیئر برادر کے ۶۲ رنز بھی انگلینڈ کو شکست سے نہ بچا سکے۔

کھلاڑیوں پرنگل، ڈی فریٹس اور ورتھ نے مطلوبہ ٹارگٹ تک پہنچنے کی بے حد کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ انگلینڈ کو میچ جیتنے کے لئے جب ۲۲ رنز درکار تھے تو عمران خان نے رمیز راجہ کے ہاتھوں آخری کھلاڑی کو آؤٹ کرادیا اور پاکستان نے فائنل جیت کر کرکٹ کے ناقدین اور ماہرین کو حیرت زدہ کردیا۔

چھوٹی چھوٹی رنجشیں بھلا کر جب لوگ ایک ہوجائیں، وطن اور قوم سے محبت جب دل میں گھر کر جائے۔ سبز ہلالی پرچم کو اونچا لہرانے کا عزم بیدار ہوجائے تو پھر ہاری ہوئی بازیاں پلٹ ہی جایا کرتی ہیں۔

چھٹے ورلڈ کپ میں ایک ایسی ہی بازی کھیلنے کی ضرورت ہے!!

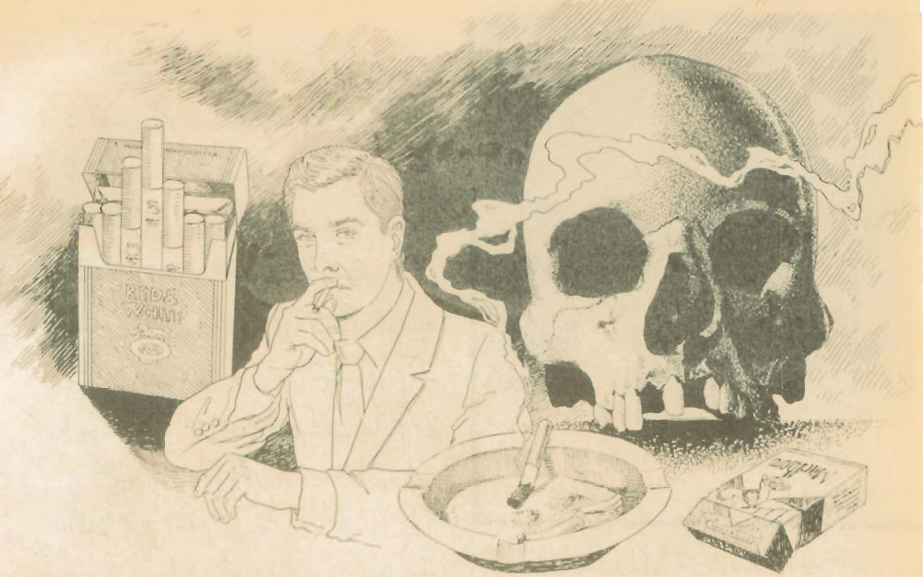

سگریٹ نوشی کیسے شروع ہوئی

محمد عمر قریشی

کیا آپ کو معلوم ہے کہ تمباکو کہاں سے آیا؟ ہمارے ہاں یہ لعنت کب اور کیسے شروع ہوئی اور اس کے نقصانات کیا ہیں؟

۱۴۹۲ء میں جب کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی تو اسے جزیرہ "کیوسرا" میں منہ اور ناک سے دھواں خارج کرنے والی ایک عجیب و غریب وحشی قوم ملی۔ کولمبس کے ساتھ جتنے بھی لوگ تھے وہ وحشیوں کی دیکھا دیکھی تمباکو کا شکار ہو گئے۔ یہی لوگ امریکہ کی وحشی قوم کی اس بُری عادت کو اپنے ساتھ یورپ لے آئے۔ براعظم یورپ کے ہر درجے کے لوگوں نے تمباکو نوشی کو بطور مہذبانہ فیشن اپنا لیا۔ ہندوستان میں جب انگریز تاجروں کا روپ دھار کر آئے تو انہوں نے تمباکو نوشی کو یہاں بھی رواج دیا۔ نتیجتاً ہندوستان کے لوگ بھی اس بُری عادت کی لپیٹ میں آ گئے۔

ایک زمانے میں تمباکو کو مشرق اور مغرب میں

دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، اب بھی اسے خون کے دباؤ کی بیماریوں کے لئے کام میں لایا جاتا ہے۔ مگر اس ایک فائدے کے مقابلے میں اس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں۔

سگریٹ دیکھنے میں تو ایک چھوٹی، نازک اور عجیب سی شے ہے مگر جب سائنس دان حضرات نے اس کے اجزا کی چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ اس کے دھوئیں میں تین سو مختلف اجزا شامل ہیں۔ ان میں مختلف گیسیں، رقیق مادے شامل ہیں۔ ان میں نو مختلف گیسیں ایسی ہوتی ہیں جو پھیپھڑوں کے لئے نہایت نقصان دہ ہوتی ہیں۔

یہ گیسیں انتہائی چھوٹے چھوٹے قطرات سے مل کر بنتی ہیں۔ یہ قطرات پھیپھڑوں کی دیواروں کی جھلی اور گلے کی نالیوں پر جم جاتے ہیں اور نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔

تمباکو میں بعض گیسیں نشہ آور ہوتی ہیں۔ یہی گیسیں سگریٹ نوشی کو عادت بنانے کا باعث بنتی ہیں۔ تمباکو نوشی کے باعث ہر آٹھ سال میں ۲۵ لاکھ افراد موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جبکہ دنیا کی چالیس فیصد آبادی سگریٹ نوشی کی عادی ہے۔

تمباکو نوشی بذات خود موت کی ایک قسم ہے۔ یہ پینے والے کی صحت کو تباہ کرنے کے علاوہ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کی صحت کو بھی نقصان پہنچاتی ہے اور فضا میں آلودگی بھی پیدا کرتی ہے۔

ہم لوگ

- سانپ سے ڈرتے ہیں کہ ڈس لے گا۔
- آگ سے گھبراتے ہیں کہ جھلسا دے گی۔
- پانی سے خوفزدہ ہیں کہ لہریں نگل لیں گی۔
- امراض سے بھاگتے ہیں کہ ہلاک کردیں گے۔
- آفات سے لرزتے ہیں کہ تباہ کردیں گی۔

لیکن

خدا سے نہیں ڈرتے جو ہر چیز پر قادر ہے اور ہمارے اعمال کا حساب لے گا۔

مرسلہ : سمیرا انگسی (کوئٹہ)

تمباکو نوشی کی کثرت سے گلے کی بیماریاں، پیٹ کا السر، خون میں خرابی، نزلہ و زکام، نظر کی کمزوری، دماغی بیماریاں، اور کینسر جیسی موذی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ اس لعنت سے نوجوانوں کی قوت ارادی بُری طرح تباہ ہو کر رہ جاتی ہے جبکہ قوت مدافعت میں نقصان دہ حد تک کمی واقع ہو جاتی ہے اور تواور دماغ کی نشوونما رک جاتی ہے۔

ان تمام باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ تمباکو نوشی قاتل زہر ہے۔ اس سے ہمیں ہر حال میں بچنا چاہئے اور بات تو تب ہے جب دوسروں کو بھی روکا جائے۔

بنام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوط

عامر جاوید تبسم، حافظ آباد۔ اس دفعہ کا شمارہ بھی بہت اچھا تھا۔ پڑھا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ سب کہانیاں "ٹاپ" کی تھیں۔ **جاوید اقبال کنہوری(؟)** میں نے کئی کہانیاں بھیجی تھیں جو کہانیاں آنکھ مچولی میں بھیجتا ہوں وہ آپ شائع نہیں کرتے لیکن دوسرے رسالوں میں وہ شائع ہو جاتی ہیں۔ ○ ۔ بھئی ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے رسالوں کا معیار زیادہ اچھا ہو گا۔ **رانا محمد شاہد، بورے والا۔ قدیر فراز، ضلع پنجگور**۔ آپ قلمی دوستی کا صفحہ کیوں نہیں شروع کرتے۔ ○ ۔ پہلے یہ صفحہ ذرا مختلف انداز میں شائع تو ہوتا رہا ہے۔ **فیاض احمد مدثر اوکاڑہ**۔ میں اردو ادب کا طالب علم ہوں، رسالوں میں میری تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ایک کہانی بھیج رہا ہوں۔ پسند آئے تو شامل اشاعت کر لیجئے گا۔ ○ ۔ خوش آمدید۔ بات یہ ہے کہ لکھنے والے

دو ایک مرتبہ تحریریں بھیجتے ہیں اگر نہ چھپے تو بالکل ہی مایوس ہو جاتے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ لکھنے والے کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ تحریر اچھی ہو تو اسے چھپنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ **جواد شیخ، فیصل آباد۔** ہمارے شہر میں آنکھ مچولی تقریباً" آٹھ یا نو تاریخ کو پہنچتا ہے۔ اس لئے ہم کسی انعامی مقابلے میں حصہ لینے کے قابل نہیں رہتے۔ آپ اس کا کوئی حل بتائیے۔ ○ ۔ آپ کی شکایت نوٹ کرلی گئی ہے۔ **طارق گلاب، پشاور۔** آپ رسالے میں لکھتے ہیں کہ نقل شدہ تحریریں شائع نہیں ہوتیں لیکن نومبر کے مینے آپ نے نقل شدہ لطیفے کو انعامی لطیفہ قرار دے دیا۔ ○ ۔ بھئی کوئی ایسی جادو کی چھڑی ہمیں لادیجئے جس سے ہم کسی تحریر کو چھو کر پتہ چلا سکیں کہ یہ تحریر کہیں چھپی ہے یا نہیں۔ پھر انشاء اللہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔ **خرم شہزاد چوہان، گوجرانوالہ۔** میں آنکھ مچولی کا خاموش قاری ہوں۔ آپ نے رسالے کی قیمت بڑھا کر اور خاص طور پر خوفناک نمبر کی قیمت بڑھا کر اچھا نہیں کیا۔ کیا کوئی غریب بچہ یہ رسالہ خرید سکتا ہے؟ **سحرش الطاف (؟)۔** انکل میں نے لطیفے بھیجے وہ نہیں چھپے کیا وہ لطیفے زور دار نہیں تھے۔ ○ ۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ **محمد ندیم اختر، ضلع لیہ۔** میں نے نہم کلاس میں بھی پوزیشن لی تھی۔ لیکن ابھی تک سند نہیں پہنچی کیا وجہ ہے۔ ○ ۔ اسناد چھپ رہی ہیں اس لئے تاخیر ہوگئی۔ **فوزیہ یوسف، حافظ آباد۔** آنکھ مچولی یوں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے مگر دسمبر کا آنکھ مچولی بہت زیادہ پسند آیا۔ خاص طور پر سرورق خوبصورت اور دلکش تھا۔ ورق ورق کر کے ایک ہی دن میں سارا رسالہ پڑھ ڈالا۔ تمام تحریریں بہترین تھیں مگر خاص طور پر "جاں نثار رسول" اور محمد خالد جاوید کی نظم اچھی لگی اداریہ بھی بہترین تھا۔ پہلی بات بہت کچھ بتا گئی۔ "کہانی انسان کی" مجھے بہت پسند ہے اور ہر ماہ اس کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ "قلم دوست" سلسلہ کی تمام کہانیاں بھی اچھی لگیں۔ **محمد ارشد مدنی، ضلع مظفر گڑھ۔** دسمبر کے شمارے کا سرورق "ایسے کو تیسا" کا منہ بولتا ثبوت تھا کیونکہ لڑکے کے فوٹو اتارنے سے پہلے ہی مومن رحیم صاحب نے اپنے کیمرے کا کمال دکھا دیا "سنہرے حروف" نے جذبہ عمل میں نیا پیٹرول بھرا "ماہ رواں کی پہلی بات" بڑی خوفناک لیکن حقیقت پسندانہ لگی۔ "پینو راما" اور "شیر اک شریف سا" ہمیں حیرت کی دنیا میں لے گئے۔ "جابر بن حیان" اور "مولانا الطاف حسین حالی" ایک نئے انداز و چاشنی کی سوانح نگاری لئے ہوئے تھیں۔ **ملک صفدر مہکلی، ٹھٹھہ۔** اس ماہ کا آنکھ مچولی لینے بازار گیا تو اس کی قیمت دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا اتنا اچھا آنکھ مچولی مگر آپ نے اس کی قیمت بڑھادی ہے اچھا نہیں کیا۔ ○ ۔ معاف کیجئے گا نظم پر محنت کی ضرورت ہے۔ **عبدالباسط، ہری پور۔** ایڈیٹر انکل میں آپ کو اتنی ساری چیزیں بھیجی تھیں ان کا آپ نے کیا کیا؟ یقیناً" ردی والے کو دے دی ہوں گی۔ میں نے آپ کو اتنی ساری تحریریں بھیجی تھیں کہ اگر آپ کو نہ بھیجتا تو اپنا ایک رسالہ شائع کر سکتا تھا لیکن آپ ہیں کہ اس میں سے ایک بھی شائع نہیں کی۔ یہ خط بھی آپ یقیناً" نہیں شائع کریں گے۔ ○ ۔

چھوٹی چھوٹی معلومات وغیرہ چھپ جائیں گی۔ **رضوان اکرم' رحیم یار خان**۔ دسمبر کے شمارے میں میری کہانی "بلاعنوان" کے نام سے شائع ہوئی جس پر عنوان لکھنے پر انعام کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں میرا نام رضوان اکرم کی بجائے رضوان اکرم ثانی چھپ گیا ہے جس وجہ سے میرے دوست یقین نہیں کرتے کہ یہ میری کہانی ہے۔ ○ ۔ لیجئے اب یقین آجائے گا۔

محمد عامر' کراچی۔ جنوری کے شمارے میں ہماری کوئی تحریر نہ تھی۔ ہماری آنکھوں میں نااُمیدی کے جگنو جھلمل کرنے لگے' مگر ایمرسن کے قول نے ہماری ہمت بندھائی کہ "یہ دنیا باہمت' پر امید اور زندہ دل لوگوں کے لئے ہے۔" **ملیحہ عبدالمتین' کراچی**۔ جنوری کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے کہانیوں میں سب سے اچھی کہانی "میرے دل میں رہو" اور "کیچپ کی ایک بوتل" لگی۔ "سنہرے حروف" ایک بہترین انتخاب ہے سب سے دلچسپ نظم "کتنی عظیم ہے تو مہنگائی" رہی۔ کہانی انسان کی جب اچھی لگنے لگی تو ختم ہوگئی۔ "موت کی آواز" ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آرہی ہے۔ ذرا تسلسل سے شائع کریں تو پڑھنے میں بھی مزا آئے۔ ○ ...... یہ قسط وار کہانی انشاء اللہ اب پورے تسلسل سے شائع ہوگی۔ **سید فرحان احمد' کراچی**۔ جنوری کا آنکھ مچولی حسین اور دلکش سرورق کے ساتھ ملا پہلی بات میں آپ نے واقعی ایک اہم مسئلے کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے۔ کاش! کہ ہم اس بات کو سمجھ سکیں۔ کہانیاں جو پسند آئیں ان میں "جن کا بچہ" "میرے دل میں رہو" اور "واپسی" پسند آئیں۔ بنام آنکھ مچولی کے صفحات بڑھادیں تو اچھا رہے گا۔ **محمد حسن عارف خان' کراچی**۔ جنوری کا خوبصورت شمارہ ملا۔ سرورق کافی رنگین اور شوخ قسم کا تھا۔ کہانیاں اور نظمیں بہترین لگیں۔ **تنویر حسین' کراچی**۔ ایڈیٹرانکل جنوری کا شمارہ کچھ دیر سے ملا۔ رسالے میں تمام تحریریں لاجواب تھیں۔ خاص طور پر اشتیاق احمد کی کہانی "میڈل" نمبرون تھی۔ **طارق گلاب' پشاور**۔ سرورق کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ تمام کہانیاں پسند آئیں۔ **خالدہ انصاری' حافظ آباد**۔ آنکھ مچولی بہت اچھا رسالہ ہے۔ ہمارے گھر میں سبھی اسے بہت شوق سے پڑھتے ہیں اس کی کہانیاں بہت معیاری ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آنکھ مچولی کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ آمین! **میمونہ عارف' کراچی**۔ نیا سال اور نیا شمارہ دونوں کی خوشی محسوس ہورہی ہے۔ ماہ رواں کی پہلی بات کے بعد "اور دعا قبول ہوگئی" "ادبی بحث" "جن کا بچہ" "جسے اللہ رکھے" "کیچپ کی ایک بوتل" "میرے دل میں رہو" "آخری اسٹاپ" اور "چھوٹا" جیسی کہانیوں کا انتخاب منفرد تھا۔ **ساحر طارق' کمالیہ**۔ اس بار آنکھ مچولی دیر سے ملا مگر اچھا لگا۔ تمام کہانیاں بھی اچھی تھیں۔

آصف اقبال

کل کے بڑے آج کے چھوٹے

199

ڈپروٹوڈان..... کنگرو تھیلی والے جانوروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ذرا قدیم زمانے کے اس تھیلی دار جانور کا آج کے کنگرو سے مقابلہ تو کریں!!

197

اس تصویر میں غیر معمولی جسامت کے قدیم پرندے اور آج کی مرغی کا فرق ظاہر ہے۔ مرغی کا قد دیکھ لیجیے اور اس مرغی نما قدیم پرندے ڈائی ٹریما کو دیکھ لیجیے جو دو میٹر لمبا ہے!!

202

یہ غیر معمولی جسامت کا زمینی جانور پانچ میٹر اونچا تھا۔ اس کی نسل سے آج کا گینڈا ہے۔ انسان کے مقابلے میں اس کی جسامت حیرت کے ساتھ ملاحظہ تو فرمائیں!!

201

کم سوناتھس نامی یہ نازک ڈائنوسار دراصل بلی سے بڑا نہیں لیکن اس کا ایک دلڑیا پالتو بلی کی طرح پل جانا ممکن نہیں تھا.....!!

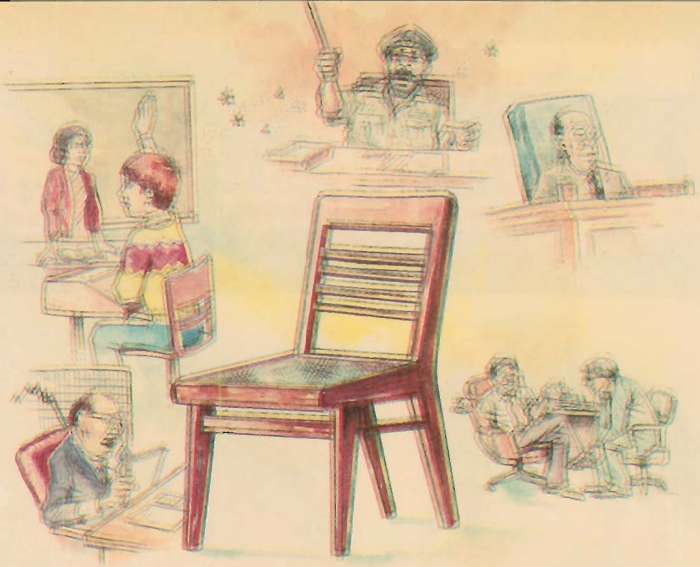

ک سے کرسی

شبانہ رشید

اگر کوئی ہم سے یہ پوچھے کہ کیا آپ کبھی کُرسی پر بیٹھے ہیں تو یقیناً "ہمیں سوال پوچھنے والے کی ذہنی حالت پر شبہ گزرے گا، لو بھلا کُرسی جیسی عام اور معمولی چیز پر کون نہ بیٹھا ہو گا مگر یہ بھولی بھالی اور عام سی چیز اتنی بھی معمولی نہیں دُنیا کے بیشتر جھگڑے اسی کُرسی کی وجہ سے ہوتے ہیں کہتے ہیں دنیا کی پہلی کرسی فرعون کے زمانے میں بنی۔ عام طور پر کُرسی کے چار پائے ہوتے ہیں اس کے بے شمار نقصانات اور بے شمار فوائد ہیں کُرسی کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں مثلاً لکڑی کی کُرسی پلاسٹک کی کرسی، لوہے کی کرسی، اسٹیل کی کرسی وغیرہ وغیرہ۔ کرسی مختلف سائز کی بھی ہوتی ہے چھوٹی کرسی، بڑی کرسی اور درمیانی کرسی۔ گھر کے اندر رکھی گئیں تمام کرسیاں عام کرسیاں ہوتی ہیں یعنی اس پر بیٹھنے سے نہ تو انسان کی عزّت کو چار چاند لگتے ہیں نہ اس پر سے اُٹھنے کے بعد آدمی کی صحت پر فرق پڑتا ہے۔ گھر کے اندر موجود کرسی کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ اپنی کرسی سے اُٹھ بھی گئے تو کوئی اس پر بیٹھنے کی کوشش نہیں کرتا اور اگر بیٹھ بھی گیا تو آسانی سے اُٹھ جاتا

ہے۔ اب بات کی جائے گھر سے باہر موجود کرسیوں کی تو اس پر اوّل نمبر ٹیچر کی کرسی ہوتی ہے۔ ٹیچر اگر گورنمنٹ اسکول کا ہے تو اس کی کرسی کے ہمیشہ تین پائے ہوں گے ایک پایہ ٹوٹ چکا ہوگا جسے ٹیچر بچے کی مرمّت کرنے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہ وہ کرسی ہے جس پر اسکول ٹیچر کبھی نہیں بیٹھتا کیوں کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ اس کرسی پر بیٹھ گیا تو یہی وہ کرسی ہے جس پر ٹیچر بچوں کو بیٹھنے سے منع کرتے ہیں اور بڑے سمجھاتے ہیں "اگر تم اپنے استاد کی کرسی پر بیٹھو گے تو نالائق ہو جاؤ گے اور پھر تمہیں سبق یاد نہیں ہوگا" ایک عرصے تک تو ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید ٹیچر کی نالائقی کی وجہ سے ہمیں اس کرسی پر بیٹھنے سے منع کیا جاتا ہے۔ ایک کرسی امتحانی مرکز میں بھی ہوتی ہے جس پر بیٹھ کر طالبعلم سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اگر آپ کوئی ایسی کرسی دیکھیں جس پر بیٹھ کر آپ کو نیند آتی ہو تو آپ سمجھ جائیں وہ کرسی کسی چوکیدار کی ہے یا پھر کسی دفتر سے آئی ہے۔ ایک اور کرسی بڑی اہمیت کی حامل ہے وہ ہے "صحافی کی کرسی" جس پر بیٹھ کر وہ عجیب و غریب اور حیرت انگیز خبریں ایجاد کرنے لگ جاتا ہے اور ایڈیسن سے بڑا موجد بن جاتا ہے۔ ایک اور کرسی بڑی مشہور ہے وہ ہے پولیس کی کرسی جس پر بیٹھنے کے بعد وہ "قوم کی محافظ" بن جاتی ہے یہ وہ کرسی ہوتی ہے جو چوروں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کے کام کو مشکل سے زیادہ آسان بناتی ہے۔ ایک کرسی وہ ہوتی ہے جس پر بیٹھنے سے پہلے بڑے بڑے رہنما "قوم کی خدمت" کے دعوے دار ہوتے ہیں اور جس پر بیٹھنے کے بعد انہیں صرف ایک چیز یاد رہ جاتی ہے وہ ہے "اپنی خدمت" قوم کی خدمت کرنے کے لئے کرسی کی نہیں جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں بڑی بڑی کرسیاں پائی جاتی ہیں جن کا ذکر نہیں کرسکتے کہ ابھی وہ ہمارے قد سے زیادہ بلند ہیں آج کل آدمی کی عزّت اس کی کرسی سے ہوتی ہے جتنی بڑی کرسی اتنی ہی زیادہ عزّت اور آپ اپنی عزّت کروانا چاہتے ہیں تو لوہے کی بڑی کرسی بنوالیں مضبوط اور نہ ٹوٹنے والی۔ یاد رکھیں! لکڑی کی کرسی سے دور رہیں اس میں اکثر کیڑا لگ جاتا ہے جو آپ کی ساخت کو متاثر کرسکتا ہے اگر کوئی آپ سے آپ کی کرسی چھیننا چاہے تو آپ وہی کرسی اس کے سر پر دے ماریں اور خود اپنی کرسی پر آرام کریں۔ عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ اپنی کرسی کبھی خالی مت چھوڑیں ورنہ دوسرے لوگ اس پر قبضہ کرلیں گے بہتر یہی ہے کہ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے... سیاست دانوں کی طرح ایلفی لگالیں تاکہ کوئی آپ کو اس پر سے اُٹھا نہ سکے!!

بکری اور مکڑی

افضال عاجز

ایک کھونٹے سے بندھی تھی ایک بکری ایک دن
بُن رہی تھی پاس ہی جالا بھی مکڑی ایک دن

دیکھ کر بکری کو اس نے یوں کیا بڑھ کر کلام
کیسی ہو بہنا مری، کرتی ہوں میں تم کو سلام

سُن کر یہ آواز بکری نے دیا تن کر جواب
بہن کہنے کی مجھے جرأت نہ کر خانہ خراب

اپنی صورت دیکھ پہلے اور میری حیثیت
میرے آگے اس جہاں میں کیا ہے تیری حیثیت

زندگی تیری گزرتی ہے مکوڑے چاٹ کر
گھاس تازہ دیتا ہے مالک مجھے تو کاٹ کر

رات دن کھاتی ہوں میں اور عیش کرتی ہوں مگر
تیری رہتی ہے ہمیشہ ننھے کیڑوں پر نظر

نہ کوئی تکلیف مجھ کو اور نہ کوئی کام ہے
زندگی پر کیف ہے، آرام ہی آرام ہے

بات بکری کی سنی مکڑی نے پھر ہنس کر کہا
اس طرح جینے کا بی بکری بھلا کیا فائدہ

رات دن مالک کی رسی سے بندھی رہتی ہے تُو
دودھ نہ دے گر، تو اس کی مار بھی سہتی ہے تُو

اپنی مرضی سے قدم تو اک اٹھا سکتی نہیں
اپنی مرضی سے تُو کوئی چیز کھا سکتی نہیں

جو تجھے مالک کھلائے اس پر ہے تیرا گزر
زندگی کس کام کی جو اس طرح سے ہو بسر

اس پہ بھی ہے ناز اتنا اور ہے اتنا غرور
تو سزا اس بات کی اک روز پائے گی ضرور

رات دن محنت سے اپنے پیٹ کو بھرتی ہوں میں
شکر پھر اس ذاتِ باری کا ادا کرتی ہوں میں

بات مکڑی کی سنی تو کسمسا کر رہ گئی
بکری کھونٹے سے بندھی تھی تلملا کر رہ گئی

چیخ کر مکڑی سے بولی، بات میری سن ذرا
ایک رسی کیا بھلا روکے گی میرا راستہ

میں تو اک آزاد بکری ہوں، نہیں تجھ کو خبر
میرا مالک تو نہیں رکھتا کبھی مجھ پر نظر

توڑ ڈالوں گی میں رسی کو چلی جاؤں گی میں
جو بھی میرے جی میں آئے گا وہی کھاؤں گی میں

یہ کہا بکری نے پھر اک زور کا جھٹکا دیا
جو بندھی کھونٹے سے تھی رسی کو پھر تڑوا لیا

باغ میں مالک کے پہنچی گھاس پھر کھانے لگی
دیکھ کر مکڑی کی جانب خود پہ اترانے لگی

لے نہ پائی تھی ابھی آزاد ہونے کا مزا
آ کے مالک نے دبایا باغ میں اس کا گلا

کھینچ کر ڈنڈا لگایا کان سے پکڑا اسے
لے کے اک موٹا سا رسا بعد میں جکڑا اسے

لگ کر پھر کھونٹے سے بکری اشک برسانے لگی
اپنی گزری زندگی پر غور فرمانے لگی

دیکھ کر بکری کی حالت ہو گئی مکڑی اداس
اپنے جالے سے نکل کر آ گئی بکری کے پاس

بولی اے نادان اب رونے سے کیا ہے فائدہ
مل گئی ہے آج تجھ کو اس تکبّر کی سزا

دے خدا تو پھر تکبّر بھی نہ کرنا چاہئے
شکر کا کلمہ ہمیں دن رات پڑھنا چاہئے

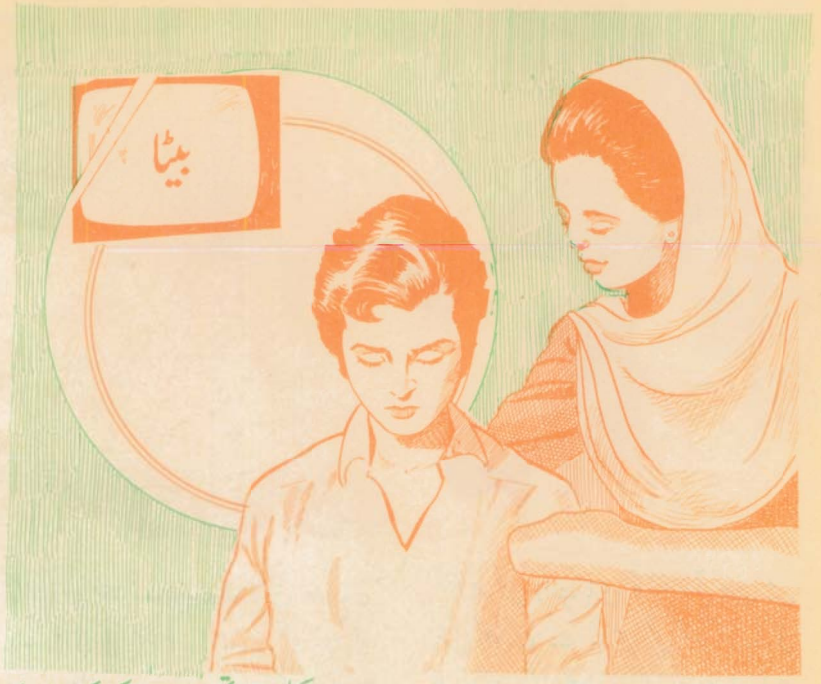

بیٹا

محمد بن مالک

غازی تھوڑی دیر پہلے ہی اسکول سے گھر آیا تھا۔ اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ آتے ہی اس نے بستہ الماری کے اندر اچھالا اور کپڑے بدلے بغیر صوفے پہ لیٹ گیا۔ غازی کی امی نے کچن سے نکل کر کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ کتابوں کی الماری کھلی پڑی تھی اور اس کے ایک خانے میں غازی کا بستہ اوندھا پڑا ہوا تھا۔ خود غازی میاں یونیفارم اور جوتوں سمیت صوفے پر دراز تھے۔ انہیں سخت غصہ آیا' "غازی!!" انہوں نے ڈانٹ کر کہا' "یہ کیا بدتمیزی ہے؟ چلو' اٹھو جلدی سے..... الماری سیٹ کرو..... یونیفارم بدل کر اور منہ ہاتھ دھو کر آؤ..... کھانا تیار ہے..... چلو' اٹھ جاؤ فوراً"..... کیا کہہ رہی ہوں میں!!" غازی خواہ مخواہ کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ امی کا اس طرح ڈانٹنا اسے سخت شاق گزرا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ امی بڑے پیار سے اسے اٹھائیں گی۔

اس کا سوجا ہوا سا منہ دیکھ کر موڈ کی خرابی کی وجہ پوچھیں گی..... پھر اسے باتھ روم تک لے کر جائیں گی.... مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ نکلا.... اس نے بستہ ٹھیک سے رکھ کر الماری بند کی اور پھر جان بوجھ کر گھسٹتا ہوا باتھ روم کی طرف چل دیا۔ کھانا کھانے کے دوران بھی اس کا منہ لٹکا ہی رہا۔ وہ امی کی جانب سے دم دلاسے اور غمگساری کا آرزو مند تھا مگر امی نے تو "جھوٹے منہ" بھی اسے نہیں پوچھا۔ غازی اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ شادی کے چھ سال بعد وہ بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہوا تھا.... لیکن اکلوتا ہونے کے باوجود اس کے امی ابو اس سے بے جا لاڈ پیار اور چاؤ چونچلے والا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بلاوجہ کا لاڈ پیار اولاد کو بگاڑنے میں سب سے بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ اولاد جوان ہو جانے پر بوڑھے والدین کا ہرگز خیال نہیں رکھتی.... وہ کہتے تھے کہ ہر چیز کا ایک موقع ہوتا ہے..... بحیثیت والدین ان کے بھی کچھ اصول تھے اور وہ ان پر سختی کے ساتھ کاربند تھے۔

غازی ایک قریبی اسکول میں پانچویں جماعت میں زیر تعلیم تھا۔ استطاعت ہونے کے باوجود امی ابو نے اسے لانے لیجانے کے لئے کوئی اسکول وین نہیں لگوائی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے پاس اپنی گاڑی بھی موجود تھی مگر وہ چاہتے تھے کہ غازی پیدل اسکول آئے جائے۔ تاکہ اسے پیدل چلنے کی عادت پڑے.... ویسے بھی اسکول گھر سے کونسا اتنی دور تھا!!

غازی خود ہی اپنی کتابوں اور کاپیوں پر کور چڑھاتا، کپڑے استری کرتا اور جوتے پالش کرتا۔ گھر میں کوئی ملازم نہیں رکھا ہوا تھا، چنانچہ گھریلو کاموں میں وہ اپنے امی ابو کا ہاتھ بھی بٹاتا تھا..... اپنا ہر کام وقت پر کرنے کی وجہ سے اس کا کوئی بھی کام ادھورا نہیں رہ پاتا تھا اور اسی وجہ سے وہ امتحانوں میں ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا تھا۔ اس کے والدین اس کی طرف سے نہایت خوش اور مطمئن تھے۔ اور اب..... گزشتہ تین ہفتوں سے اس کی زندگی میں عجیب انقلاب آیا ہوا تھا..... وہ چڑچڑا اور بد مزاج ہو گیا تھا۔ کوئی بھی کام وقت پر نہیں کرتا تھا جس کی وجہ سے اسے نہ صرف گھر میں کئی بار ڈانٹ سننے کو ملی تھی بلکہ اسکول سے بھی اس کی شکایتیں کئی دفعہ گھر پہنچ چکی تھیں۔ اس کے ماں باپ حیران تھے کہ ان کے فرماں بردار بیٹے کو یکدم یہ کیا ہو گیا ہے؟ کئی دفعہ پوچھنے پر بھی اس نے اپنی اس تبدیلی کی وجہ نہیں بتائی..... پھر پیار سے سمجھانے پر بھی وہ نہیں سدھرا تو انہوں نے سختی کرنے کی کوشش کی مگر وہ سرکشی پر آمادہ ہو گیا..... "بڑا" جو ہو گیا تھا۔

تب انہوں نے فیصلہ کیا کہ اسے فی الحال

اس کے حال پہ چھوڑ دیا جائے اور خود سے اس کی موجودہ کیفیت کا سبب جاننے کی کوشش کی جائے تاکہ اس مسئلے کا کوئی حل نکالا جاسکے وہ خاموشی سے اس کی حرکتوں کو برداشت کرتے رہے۔

غازی کی پرسکون زندگی کے تالاب میں پتھر دراصل اس کے کلاس فیلو توصیف نے پھینکا تھا۔ ایک دن غازی حسب معمول پیدل اسکول جارہا تھا۔ ابھی اس نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ ایک لمبی سی کار اس کے برابر آکر رکی۔ اس نے چونک کر دیکھا گاڑی میں اس کا نیا کلاس فیلو توصیف بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اس کے پاپا موجود تھے۔

"ارے غازی' پیدل اسکول جارہے ہو؟" توصیف نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"اور کیا!! میں تو روز ہی پیدل اسکول جاتا ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو آؤ بیٹھو' میں تمہیں لے چلتا ہوں۔"

غازی جھجھکتا ہوا اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

راستے میں توصیف نے غازی سے اس کے پیدل اسکول جانے کی وجہ پوچھی تو اس نے مسکرا کر کہا' "میرے امی ابو چاہتے ہیں کہ میں اپنے اندر محنت مشقت کی عادت ڈالوں کیونکہ ضروری نہیں کہ آرام و آسائش کی اشیا انسان کو ہمیشہ میسر رہیں لہٰذا اسے آنے والے حالات کے لئے پہلے سے تیار رہنا چاہئے ورنہ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں بھی تمہاری طرح اپنی گاڑی میں آرام سے بیٹھ کر آجا نہ سکوں۔"

"تو کیا تم اپنے کام بھی خود ہی کرتے ہو؟" توصیف نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے فخریہ لہجے میں کہا' "جو کام مجھ سے ہو سکتا ہے اس کے لئے میں بلاوجہ اپنے امی ابو کو تکلیف نہیں دیتا۔ اسی وجہ سے ہم لوگوں کو کبھی ملازم کی ضرورت پیش نہیں آئی۔"

"حیرت ہے۔" توصیف آہستہ سے بولا "میرا خیال تو یہ ہے کہ جب آدمی کو آرام و آسائش کی چیزیں اور تمام سہولیات میسر ہوں تو ان سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت ہے۔ ارے بھائی' کام تو وہ لوگ کرتے ہیں جو مجبور ہوں..... تمہیں بھلا کیا مجبوری ہے؟"

توصیف کے الفاظ نے غازی کے خیالات میں ایک ہلکی سی ہلچل مچا دی تھی۔ وہ چپ بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ اسکول.... آگیا۔

"یار غازی! تم اپنے اور اپنے گھر کے بیشتر کام خود ہی کرتے ہو' جیسا کہ تم نے مجھے بتایا ہے..... مجھے تو لگتا ہے کہ تم اپنے ماں باپ کے سگے بیٹے نہیں ہو.....!!" ایک دن توصیف نے اچانک کہا۔

"کیا مطلب...؟" غازی بری طرح سے چونک پڑا۔

"مطلب یہ کہ یار کوئی اپنی سگی اور اکلوتی اولاد سے بھی اس طرح کا سلوک کرتا ہے؟ تمہارے ابو اتنے امیر ہیں پھر بھی ایک ملازم تک نہیں رکھ سکتے! مجھے تو شک ہے کہ وہ تمہیں بچپن میں کہیں سے لے کر آئے تھے۔" توصیف نے اتنی بڑی بات کہہ ڈالی۔

غازی کے ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے۔ وہ کہانیاں پڑھنے کا بڑا شوقین تھا..... اسے اپنی پڑھی ہوئی وہ تمام کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں بے اولاد جوڑے یتیم خانوں سے لاوارث بچوں کو لے کر پال لیتے ہیں۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ خود بھی ان کہانیوں کا ایک کردار ہو.....

غازی، توصیف کی باتوں کو ہرگز خاطر میں نہ لاتا، اگر وہ اس کی دوستی اور "ہمدردانہ" باتوں کے سحر میں بری طرح سے گرفتار نہ ہوتا۔ بس..... یہیں سے اس کی حیران کن تبدیلی کا آغاز ہوا۔ اب اپنا گھر اسے اجنبی اجنبی سا لگتا..... ابو کی پیار بھری باتوں سے اسے سوتیلے پن کی بو آتی اور امی کی مشفقانہ سرزنش اس کو سوتیلی ماں کا ظلم و ستم محسوس ہوتی..... اسے کوئی کام کرنے کو کہا جاتا تو وہ اپنے آپ کو نوکر سمجھنے لگتا۔

ایک شام کو غازی کے ابا آفس سے آئے تو وہ اپنے ساتھ آئسکریم بھی لے کر آئے۔ انہوں نے آتے ہی آئسکریم فریج میں رکھ دی۔ غازی نے آئسکریم کھانے کی فرمائش کی۔ امی نے کہا، "بیٹا، کل دوپہر کو اسکول سے آنے کے بعد کھالینا۔ اس وقت ہلکی ہلکی سردی ہو رہی ہے۔ کہیں نزلہ زکام نہ ہو جائے۔"

غازی یہ سن کر اپنے کمرے میں آگیا اور بستر پہ لیٹ گیا۔ امی ابو تو میری کوئی خواہش پوری کرنا ہی نہیں جانتے۔ سوتیلا جو ہوں، اس نے لیٹے لیٹے سوچا۔ ساتھ ہی محرومی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔ رات کا نجانے کونسا پہر تھا، جب اس کی آنکھ کھلی امی ابو اپنے بیڈ پر موجود نہیں تھے..... وہ آہستگی سے اٹھا اور برابر والے کمرے میں جھانکنے لگا..... وہاں بھی کوئی نہیں تھا..... البتہ ڈرائنگ روم میں روشنی ہو رہی تھی..... وہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ ابو کہہ رہے تھے..... "اسے ہرگز پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ ہمارا سگا بیٹا نہیں ہے۔ گل خان! تم ہمیں بلیک میل کرنا چھوڑ دو..... ہم تمہیں پہلے ہی اس کے دو لاکھ روپے دے چکے ہیں۔"

گل خان نامی شخص کی آواز آئی، "ہم نے تمہیں بلیک میل کب کیا؟ ہم تو یہ کہہ رہا ہے کہ

تم ہمیں ایک لاکھ روپیہ اور دے دو..... پھر ہم تمہارا بیٹے کو کچھ نہیں بتائے گا۔" امی کی آواز سنائی دی، "ایک لاکھ تو بہت ہیں، تم پچاس ہزار روپے لو اور ہمارا پیچھا چھوڑ دو، ورنہ ہم پولیس کو بلوائیں گے۔"

گل خان نے قہقہہ لگایا، "شوق سے بلواؤ، ہم یہیں پہ انتظار کرتا ہے۔" غازی کا دماغ سُن ہو کر رہ گیا تھا..... تو گویا میرا شبہ صحیح نکلا، اس نے سوچا، مگر یہ گل خان کون ہے" امی ابو اس سے عجیب سی آوازوں میں کیوں باتیں کر رہے ہیں؟ اور یہ موسیقی کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟" اس کے ذہن میں تمام باتیں گڈمڈ ہونے لگیں..... پھر اس سے رہا نہ گیا..... اس نے کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکا کر اندر جھانکا..... اندر امی اور ابو صوفے پر مزے سے بیٹھے ہوئے ٹیلی وژن پر این ٹی ایم سے آنے والی فلم "بیٹا" دیکھ رہے تھے!!

غازی کو یوں لگا جیسے اس کے سر پر لدا بوجھ اک دم ہلکا ہو گیا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا امی کے قریب جا بیٹھا۔ امی نے اسے اچانک اپنے قریب دیکھا تو محبت سے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر بڑے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

دل و دماغ کی اضافی قوت
کے لئے مُربّہ سیب چاندی کے
ورق میں لپیٹ کر کھائیے

احمد کا

مُربّہ سیب

انتہائی مقوی

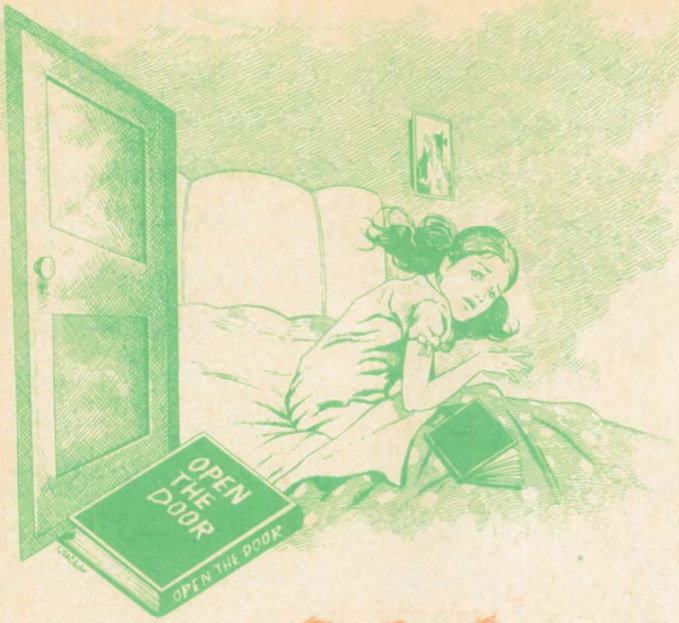

اوپن دی ڈور

اکمل شاکر

جولائی کی وہ ایک خنک سی شام تھی۔ ہماری تعطیلاتِ گرما ختم ہو رہی تھیں اور ہمیں اپنے دادا جان کے گھر پسنی سے پنجگور واپس جانا تھا۔ اب ہماری روانگی میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ پسنی میں دادا جان کا بڑا، کشادہ گھر بہت ہی خوبصورت جگہ پر ہے۔ وسیع و عریض کھجوروں کا باغ، قسم قسم کے سرسبز و شاداب درخت، دیسی اور انگریزی پھولوں کے پودے، سب کچھ بہت دلکش تھا۔ میں اپنے چچا زاد اور تایا زاد وغیرہ کے ساتھ مل کر کبھی اشٹاپو کھیلتی کبھی اُلّی اُلّی تو کبھی بلّی بلّی کھیلتی۔ پھر ان کھیلوں سے موقع ملتا تو دادا جان کی بڑی سی خوبصورت لائبریری میں گھس جاتی اور گھنٹوں وہاں بیٹھی کہانیوں کی کتابوں سے جی بہلاتی رہتی۔ بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ

گرمی کی تعطیلات کا میرا بیشتر وقت اسی لائبریری کی نذر ہوا۔ میں نے دادا جان کی ترتیب سے لگی ہوئی کتابوں کو اپنی لاپروا فطرت کی وجہ سے اُتھل پتھل کر کے رکھ دیا تھا۔ دادا جان کو خود کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنی جگہ پر ہی دیکھتے' وہ جگہ پر نہ ملتی تو سمجھ جاتے یہ بڑی حرکت میری ہے۔ میں سامنے ہوتی تو مجھ سے پوچھ لیتے نہیں تو خود ہی تلاش کرتے۔ کبھی کبھی مجھے ڈانٹ پڑجاتی ....." خبردار .... جو آئندہ لائبریری میں قدم رکھا....." مگر میں ان کی اس پیار بھری ڈانٹ کا کب نوٹس لیتی۔ میرا جب دل کرتا ان کی لائبریری میں جاگھستی..... ایک دن ان کی لائبریری میں گھسی ابھی میں نے قدم رکھا ہی تھا کہ ایک آہٹ سی محسوس ہوئی..... میں سمجھی دادا جان آگئے ہیں' وہ ضرور مجھے ڈانٹیں گے۔ بس اسی خوف کی وجہ سے لائٹ بھی نہیں جلائی اور جو کتاب ہاتھ لگی وہ دبے پاؤں لے کر دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی۔ باہر نکل کر دیکھا' کتاب کا نام تھا "اوپن دی ڈور" یعنی دروازہ کھولو.....نام پسند آگیا۔ پڑھنے کے لئے میں کمرے میں داخل ہی ہورہی تھی کہ دادا جان کی آواز سنائی دی "چلو غروب آفتاب کا منظر دیکھنے چلتے ہیں سمندر کے کنارے ....." میں نے فوراً" بہانہ کیا.... "دادا جان ..... اس وقت تو مجھے ہوم ورک کرنا ہے۔ میں کل چلوں گی آپ کے ساتھ۔" "ہاں بیٹی ٹھیک ہے پہلے تعلیم' پھر کچھ اور....." دادا جان نے تائید کی پھر زیرِ لب یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے کہ آج کل بچوں کو ان کی بساط سے زیادہ ہوم ورک دے دیا جاتا ہے۔ دادا جان تو بالاچ کو اپنے ساتھ لے کر سمندر کے کنارے غروب آفتاب کا منظر دیکھنے چلے گئے اور میں آرام سے اپنے کمرے میں ایزی چیئر پر نیم دراز ہو کر کتاب پڑھنے لگی۔

پڑھتے پڑھتے انجانے خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ کتاب بہت ہی ڈراؤنی بلکہ بے حد خوفناک قسم کی تھی۔ دادا جان گھر واپس آچکے تھے۔ اس کا علم مجھے بالاچ سے ہوا' جو مجھے کھانے کے لئے بلانے آیا تھا۔ میں نے نشانی کے لئے کتاب کا صفحہ موڑا اور اس کے ساتھ کھانے کی میز پر پہنچ گئی۔ کھانے کے دوران دادا جان مجھے اور سب کو اچھی اچھی باتیں بتاتے رہے۔ یہ دادا جان کی عادت تھی کہ کھانے کے وقت سب ایک جگہ جمع ہوتے اور یہی وقت ان کی ہدایات اور مشوروں کا ہوتا تھا۔ کھانے کے بعد میں وہاں سے اٹھی تو انہوں نے کہا۔" بیٹی ہوم ورک کے لئے زیادہ دیر تک مت جاگتی رہنا۔ صبح سویرے اٹھ کر کرلینا۔" میں "جی اچھا" کہہ کر اپنے کمرے میں پہنچ

گئی ..... میری آنکھوں میں نیند کہاں سے آتی۔ وہاں تو اوپن دی ڈور کا خوف سمایا ہوا تھا۔ میں نے پھر کتاب پڑھنی شروع کر دی۔ جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ویسے ویسے میرے خوف میں بھی اضافہ ہوتا جاتا..... پھر نہ جانے کب میں یوں ہی نیند کی پُرسکون وادی میں پہنچ گئی۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ سامنے دیکھا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور پھر بستر پر آن کر لیٹ گئی ابھی دوبارہ میری آنکھ لگی ہی تھی کہ ٹن، ٹن کی آواز سے نیند اچاٹ ہوگئی .... وال کلاک ۱۲ بج چکنے کا اعلان کر رہی تھی۔ ۱۲ گھنٹیاں بجا چکنے کے بعد کمرے کی خاموشی میں گھڑی کی ٹک ٹک گونجنے لگی۔ مجھے انجانا سا خوف محسوس ہونے لگا۔ میں نے اپنے وجود کو پیر سے سر تک چادر میں چھپالیا۔ میرا جسم ائرکنڈیشنر چلنے کے باوجود پسینے میں شرابور تھا..... پھر میں نے دروازے پر دستک محسوس کی، جیسے کوئی آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ ہاں مجھے یاد آیا اوپن دی ڈور کا بھوت بھی تو اسی طرح رات کو دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور جو بھی دروازہ کھولتا ہے اس کی گردن میں اپنی تیز ناخون والی انگلیاں پیوست کردیتا ہے.....'' اف ....یااللہ میری حفاظت فرما.....'' میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ میں نے چادر کا ایک کونا اپنے کانوں پر اچھی طرح لپیٹ

نپولین کا حافظہ

فرانس کے بادشاہ نپولین بوناپارٹ کا حافظہ اور سننے کی قوت اتنی زیادہ تھی کہ اسے اپنی فوج کے ہر سپاہی کا نام یاد تھا۔ وہ آواز سن کر بتادیا کرتا تھا کہ فلاح سپاہی بول رہا ہے۔

لیا۔ مگر دروازے پر دستک دینے کی آواز مجھے برابر سنائی دیتی رہی۔ میں خوف سے بُری طرح کانپنے لگی تھی۔ دل ہی دل میں جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو..... کا ورد بھی کر رہی تھی۔ پھر پتہ نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔ اس دن مجھے اردو کے اس محاورے پر بھی یقین آگیا کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔

صبح بیدار ہوئی۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کے لئے ٹیبل پر پہنچی تو وہاں میری چھوٹی بہن حانی اور بھائی بالاچ مجھ سے پہلے موجود تھے۔ اس سے پہلے کہ میں سب کو رات کا واقعہ سناتی۔ حانی مجھ پر برس پڑی....''باجی کیا ہوگیا تھا رات کو، آپ سوتے میں جانے کیا کیا بڑبڑا رہی تھیں۔ اور چیخ بھی رہی تھیں''۔ بالاچ ہنس کر بولا۔ ''ارے چھوڑو حانی دیکھ لی باجی کی بہادری ..... یقیناً'' رات کوئی ڈراؤنا ناول پڑھتے پڑھتے سوئی ہوں گی۔''

اور مجھے واقعی اپنی بزدلی پر افسوس ہونے لگا۔ رات کو دروازے پر دستک دینے والی حانی تھی اوپن دی ڈور کا بھوت نہیں۔

مزید محنت کی ضرورت ہے

ناقابلِ اشاعت تحریروں کا کالم

"سیر سوا سیر" "بھولنے کی عادت" عرفان محمد حسین، کراچی۔ "حافظ شیرازی" سید یحییٰ حسینی، کراچی۔ "ڈارک روم" صبا فیاض، ملتان۔ "بچے اور ان کے مسائل" رانا طارق جاوید، اوکاڑہ۔ "محبت" عدنان اظہر، کراچی۔ "نئی ایجاد اور" محمد اختر سردار، کسووال۔ "سنو ہماری بات" تابندہ ملک، راولپنڈی۔ "خوشگوار دن" "عجیب اتفاق" عرومہ یونس، اسلام آباد۔ "خالی ہاتھ" زبیدہ کاظمی، چمبڑ۔ "نامعلوم کیس" عنبرین عشرت، کراچی۔ "ڈوبتے سورج کا عہد" (؟) "چور" "ایک عجیب خواب" رضوانہ، کوئٹہ۔ "محنت سے راحت" جوہر تھانوی، کراچی۔ "آسیبوں کا جنگل" محمد یونس نمسی، کندھ کوٹ۔ "سیفٹی الارم" شمائلہ قاسم، کراچی۔ "گل نینا" خالد خان، گڑھی سرفراز۔ "پراسرار آنکھیں" ثناء اختر قریشی، اسلام آباد۔ "ہماری کام والی" (؟) "زیست کی تلخی" نادیہ مجید، کراچی۔ "پاسٹ واچ" ندیم حیدر رضوی، کراچی۔ "ہم آزاد ہیں" رابعہ زاہد، لاہور۔ "چغل خور" محمد آصف، گجرات۔ "حمد" (؟) "خطاب بہ نوجوان" ایم افضل، شیخوپورہ۔ "تعلیم و تربیت" نثار احمد ہاشمی، کراچی۔ "خواہش" زوار حسین بجلانی، مردان۔ "حکمت رب" سلمیٰ بلال، کراچی۔ "جھنڈا ہمارا" عثمان مقصود، سیالکوٹ۔ "خطرناک شرارت" محمد فیصل، کراچی۔ "نیک ڈریکولا" عدیل ستار، کراچی۔ "ننھی نوشہ" ارم ہدایت، میانوالی۔ "بھائی جان! سگریٹ چھوڑ دیں" شیر نواز گل، پشاور۔ "مباحثہ" محمد سلمان کراچی۔ "ظالم چچا" "دانت اور غذا" پیر صغیر احمد، لاڑکانہ۔ "خود اعتمادی" رضوانہ کوئٹہ۔ "عالم غیب سے واپسی" صائمہ نادر حسن، حیدر آباد۔ "علمی مقابلہ" (؟) "بھارت کی کہانی" "اف یہ فیشن" شہناز حمید، کراچی۔ "لڈن میاں" "آنکھ مچولی" جبران حبیب، کراچی۔ "سزا" تنویر احمد، ساہیوال۔ "لگن" طلحہ محمد عارف، کراچی۔ "قربانی" آمنہ جہانگیر، کراچی۔ "ہماری ہے جان" محمد حسین عارف، کراچی۔ "بہادر لڑکا" محمد فیصل، فیصل آباد، "سچ اور جھوٹ" "شرارت" کمال احمد حازم، حیدر آباد۔ "عظیم قربانی" محمد صدیق، حیدر آباد۔ "انتقام کی آگ" "بے قصور" "گدھے کے بھائی" "استانی" عظیم اختر میمن، حیدر آباد۔ "کیسے کیسے لوگ" محمد یونس کھتری، کراچی۔ "محتاج گورنر" ارشاد اللہ (؟) "اسمبلی سے براہ راست" عتیق الرحمٰن، موڑہ کیتال۔ "بچپن کی باتیں" حمیرا ناز (؟) "نظم" محمد وسیم عالم، گوجرانوالہ۔ "دوربین کا کارنامہ" سمن حامد (؟) "وہ کون تھا" نعمانہ امیر اعوان، جہلم۔ "غصہ" احسن رشید، راولپنڈی۔ "سہارا" سجاد الحق، گجرات۔ "خونی مہم" علی حسن، کراچی۔ "قدرت کا انتقام" "بھوت پہیلی" کامران عتیق، کراچی۔ "خوف" عبدالرافع شیخ، شہداد کوٹ۔ "پراسرار رات" محمد منصور شیخ، کراچی۔ "خوفناک منصوبہ" عبدالباسط، ہری پور۔ "خوفناکیاں" محمد ادریس داؤد، پشاور۔

جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے

تحریر: سیدہ ماہ نور جعفری، گجرات

اس وقت میں آپ کو ایک ایسا سچا واقعہ سناؤں گی جس کو سن کر آپ کا دل کانپ اُٹھے گا۔ یہ واقعہ رات کے وقت رونما ہوا تھا دن کے وقت اگر یہی واقعہ ہوتا تو ہم پریشان ضرور ہوتے لیکن اتنا خوف طاری نہیں ہوتا۔ رات کے وقت اگر کوئی واقعہ پیش آئے تو ذہن میں عجیب و غریب قسم کے خیالات آتے ہیں اور دل میں خوف پیدا کرتے ہیں ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے ہمارا معمول ہے کہ کوئی کتاب پڑھتے ہیں۔ اس رات ہم آنکھ مچولی کا "خوفناک نمبر" پڑھ رہے تھے۔ باہر طوفانی بارش ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی کتوں کے بھونکنے کی

ہوا یوں کہ...

آوازیں آ رہی تھیں۔ پڑھتے پڑھتے جانے کس وقت آنکھ لگ گئی۔ ایک دم کسی کی زور سے چیخنے کی آواز آئی۔ آپ سوچیں اگر کوئی گہری نیند میں ہو اور کسی کی چیخ سے اچانک اٹھ بیٹھے تو اس کا کیا حال ہوگا۔ ہم نے ہمت کر کے اوپر والی منزل کی کھڑکی سے نیچے گلی میں جھانکا تو کیا دیکھا کہ وہاں لوگ جمع تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ ہم بھی سہمے سہمے نیچے اترے اور دروازہ کھول کر باہر گئے تو یہ دیکھ کر چیخ نکل گئی کہ وہاں تو بجلی کے کھمبے کے ساتھ دو آدمی اور ایک گھوڑا چمٹے ہوئے تھے ان کا رنگ زرد اور آنکھیں باہر کی طرف نکلی ہوئیں تھیں لیکن خوش قسمتی سے وہ زندہ تھے۔ ان کی عورتیں بچے رو پیٹ رہے تھے۔ آج کل کے لوگوں میں تو جیسے انسانیت نام کو نہیں ہے۔ کوئی بھی ان کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کر رہا تھا۔ ہمارے بڑے بھائی کے کہنے پر کوئی بھاگ کر چھڑی لے آیا۔ لیکن چھڑی اتنی چھوٹی تھی کہ اس سے کیا ہو سکتا تھا خیر بڑے بھائی دوڑ کر گھر گئے گھر میں چھت بنانے کے لکڑی کے

بالے پڑے تھے۔ ہم ان میں سے ایک بالا لے آئے کیونکہ بالا بھاری تھا۔ اس لئے تین آدمیوں نے پکڑ کر بالے کو آدمیوں اور کھمبے کے درمیان سے گزارا اور زور لگا کر کھینچا تو گھوڑے سمیت دونوں آدمیوں کو جھٹکا لگا اور وہ دور جا گرے جلدی جلدی ان سب کو چارپائیوں پر ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔ سب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دونوں کی جان بچ گئی۔ بعد میں اصل واقعہ کا یہ پتہ چلا کہ ایک کوچوان اپنے گھوڑے کو ساتھ لے کر تانگے میں جوتنے جا رہا تھا۔ بارش کا پانی چاروں طرف کھڑا تھا۔ جس کی وجہ سے پتا نہ چل سکا اور گھوڑا نالے میں گر گیا۔ قریب ہی بجلی کا کھمبا بھی تھا۔ کوچوان نے گھوڑے کو نکالنے کے لئے کھینچا اور سہارے کے لئے جیسے ہی ہاتھ کھمبے پر رکھا تو گھوڑے کے ساتھ وہ بھی کھمبے سے چمٹ گیا۔ کوچوان کا باپ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے جب اپنے بیٹے کو اس حال میں دیکھا تو وہ اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے بڑھا اور اور جیسے ہی اس نے بیٹے کو ہاتھ لگایا تو وہ بھی اس کے ساتھ ہی چمٹ گیا اس واقعے سے پتا چلا کہ بجلی ہمارے لئے بہت فائدہ مند ہے۔ مگر ذرا سی لاپرواہی سے ہمیں کہیں زیادہ نقصان پہنچا سکتی ہے۔ بہرحال ان دونوں آدمیوں کا اور گھوڑے کے زندہ سلامت بچ جانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ کیونکہ بھاگ دوڑ میں تقریباً" وہ بیس منٹ کھمبے کے ساتھ چمٹے رہے۔ لوگوں کی مدد اور بروقت طبی امداد نے انہیں بچالیا۔ سچ کہتے ہیں جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

نئی زندگی

افشین علی

مجھے اپنی دادی سے بہت محبت ہے اور وہ بھی ہم سے بہت محبت کرتی ہیں۔ مستقل رہائش ان کی امریکہ میں ہے لیکن دو یا تین سال کے بعد ملنے کی غرض سے پاکستان آتی ہیں۔ پچھلے سال جولائی کو بھی چچا کی شادی کی غرض سے پاکستان آئیں۔ شادی سے فرصت پانے کے بعد ۹ جنوری ۹۵ء کو دادی، دادا اور چچا کے ہمراہ عمرہ کے لئے روانہ ہوگئیں۔ تقریباً" پندرہ دن کے بعد واپسی ہوئی۔ چچا اپنی ملازمت کے سلسلے میں جدہ میں رک گئے۔ جب سے دادی واپس آئی تھیں۔ انہیں نزلہ، زکام کی شکایت تھی رمضان شروع ہوگئے تھے۔ پہلا اور دوسرا روزہ دادی نے ساتھ کھولا۔ ۳ رمضان کو ان کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی اور بخار اور جسم میں درد کی شکایت بتانے لگیں دراصل اسپتال اور دوائیوں وغیرہ سے گھبراتی ہیں لیکن جب ان کی طبیعت زیادہ

خراب ہونے لگی تو ان کے منع کرنے کے باوجود ۵ جنوری ۹۵ء کو ایمرجنسی میں آغا خان ہسپتال لے گئے اور مختلف چیک اپ کے بعد ڈاکٹروں نے انتہائی خطرناک بیماری گردن توڑ بخار بتایا۔ جسے سن کر سب پریشان ہوگئے کیونکہ یہ کوئی عام بیماری نہیں ہے اور اس میں بچنا انتہائی مشکل ہوتا ہے ڈاکٹروں کے مطابق انہیں بہت دیر ہوگئی تھی لہٰذا دادی جان کو آغا خان ہوسپٹل کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں داخل کرا دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے مکمل طور پر مایوس کردیا تھا۔ میرے داد' ابی' امی پھپھو اور دوسرے کئی رشتے دار سب پریشان تھے۔ کسی کو ہوش نہیں رہتا تھا کہ روز افطار کب کرنا ہے۔ سب دادی کی زندگی کے لئے دعا گو تھے۔ وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہیں کہ کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرا جس میں ہم نے رو رو کر دادی کی زندگی کے لئے دعائیں نہ مانگی ہوں کیوں کہ ہمیں اپنی دادی بہت پیاری ہیں اور ہم انہیں ہرگز ہرگز کھونا نہیں چاہتے تھے۔ دادی مستقل بے ہوش تھیں ڈاکٹروں نے مایوسی سے کہہ دیا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو انہیں لے جاسکتے ہیں لیکن ڈاکٹروں کی مایوسی کے باوجود ہمیں امید تھی۔ حیدر چاچا جو کہ جدہ سے واپس آگئے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ انہیں امریکہ لے جائیں لیکن ڈاکٹرز اتنے لمبے سفر کی اجازت بھی نہیں دے سکتے تھے۔ امریکہ میں مقیم حسن چاچا کو بھی پاکستان بلالیا۔ اس کے علاوہ امریکہ میں ایک چچا اور میرا بھائی الگ پریشان تھے۔ میں وہ دن بھول نہیں سکتی جس دن ایک ڈاکٹر نے مایوسی سے میرے ابی اور چچا سے کہہ دیا کہ اب ان میں دم نہیں رہا۔ ہم بہت زیادہ مقدار میں (Antibiotics) دے رہے ہیں لیکن سب بے اثر ہیں کیونکہ جراثیم ان کے خون میں شامل ہوگئے ہیں۔ بے ہوش ہوئے دادی کو مسلسل ایک ہفتے سے زیادہ ہوگیا تھا مجبوراً" انہیں پرائیوٹ روم میں شفٹ کردیا گیا۔ حیرت انگیز طور پر اسی دن ۱۲ فروری کی شام انہیں ہوش آگیا۔ ہمیں بالکل یقین نہیں آرہا تھا۔ خوشی کے مارے سب کے آنسو نکل آئے۔ ڈاکٹر بھی حیران تھے کہ اس بیماری میں بہت کم لوگ بچتے ہیں صبح اور شام کتنا فرق ہے کہ صبح ڈاکٹر نے بالکل مایوس اور ناامید کردیا اور شام کو دادی نے آنکھیں کھول دیں ہم اللہ تعالیٰ کے بہت شکر گزار ہیں کہ انہوں نے دادی کو نئی زندگی دی رات کو جب ہم ہسپتال پہنچے تو دادی کے کمرے میں تقریباً" پورا خاندان موجود تھا اور دادی کو کچھ علم نہیں تھا کہ ان پر کیا گزر گئی اور ہم پر کیا گزر گئی۔ دادی گھر واپس آئیں تو ہم نے ان کے کمرے کو سجایا۔ عید قریب تھی شاپنگ وغیرہ کی وہ عید سب سے زیادہ اچھی عید تھی۔ اب

دادی' دادا' چچا اور پھپو وغیرہ سب امریکہ چلے گئے ہیں اب دادی ماشاء اللہ سے صحت یاب تو ہیں لیکن بیماری کے بعد سے ان کو سنائی تھوڑا کم دینے لگا ہے امریکہ میں ان کا مکمل علاج ہو رہا ہے اور دعا ہے کہ وہ انشاء اللہ جلد ہی مکمل صحت یاب ہو جائیں۔ (آمین) ویسے مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری دادی کو صرف ہم لوگوں کی شدید محبت کو دیکھتے ہوئے نئی زندگی دے دی۔

کیا آپ ناراض ہیں؟

اگر آپ

- اس لئے ناراض ہیں کہ آنکھ مچولی میں بھیجی ہوئی تحریر شائع نہیں ہوئی تو ذرا سوچیے کہ ایسا کیوں ہوا؟
- کیا آپ کی تحریر نقل شدہ تھی۔؟
- پہلے شائع ہو چکی تھی؟
- صفحے کے دونوں طرف اور لائن چھوڑے بغیر لکھی گئی تھی۔
- پنسل سے یا اتنے مشکل رسم الخط میں لکھی گئی تھی کہ پڑھی نہیں جا رہی تھی؟
- چھوٹے پرزوں پر لکھی گئی تھی؟
- ایک ہی صفحے پر بہت سی تحریریں لکھی گئی تھیں؟
- آپ کی تحریر کا انداز بیان، خیال اور اسلوب بچوں کی نفسیات سے ہٹ کر تھا؟
- آپ کی تحریر مشکل اور گنجلک تھی؟
- آپ کی تحریر میں مقصدیت کا فقدان تھا۔؟
- تو پھر سوچیے کہ آپ کی تحریر کیونکر شائع ہو سکتی تھی۔
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر شائع ہو تو اوپر بیان کی گئی تمام باتوں سے بچیں۔
- یاد رکھیے! بڑا ادیب بننے کے لئے مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے۔

(اجادہ)

مقابلہ معلوماتِ عامہ

صحابہ کرامؓ

سلسلہ نمبر ۱

صحابہ کرامؓ کی زندگیاں آنحضورؐ کی فیضانِ تربیت کا ثمر ہیں۔ یہ وہ مقدّس گروہ ہے جس کے بارے میں پیارے نبی کریمؐ کا فرمان ہے : "میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کی پیروی کروگے ہدایت پاؤ گے۔"

صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ زندگیوں کا مطالعہ اور ان کے بارے میں جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ آنکھ مچولی اس ماہ سے صحابہ کرامؓ کے بارے میں ایک معلوماتی مقابلے کا سلسلہ شروع کر رہا ہے۔ اُمید ہے آپ اس مقابلے میں ذوق و شوق سے حصّہ لیں گے!

اس سلسلے کا پہلا مقابلہ حاضر خدمت ہے!!

جوابات ارسال کرنے کی آخری تاریخ ۵/اپریل ہے!

۱۔ پہلے صحابیٔ رسولؐ کا نام بتایئے؟

۲۔ مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کا اصل نام تو بتایئے؟

۳۔ ان خلیفۂ رسولؐ کا نام بتایئے جنھوں نے سب سے پہلے مردم شماری کروائی تھی؟

۴۔ غُلاموں میں سب سے پہلے کون مُسلمان ہوئے تھے؟

۵۔ ان صحابیٔ رسولؐ کا نام بتایئے جنھوں نے ہجرت مدینہ کی رات اپنے کپڑے کو پھاڑ کر چیتھڑوں سے غارِ ثور کے سُوراخوں کو بند کیا تھا؟

۶۔ آنحضرتؐ کا شاعر کن صحابی کو کہا جاتا ہے؟

۷۔ چین میں سب سے پہلے کن صحابیؓ نے مسجد بنوائی تھی؟

۸۔ ان صحابی کا نام بتایئے جنھوں نے جنگِ یمامہ میں دونوں پنڈلیوں کے کٹ جانے کے باوجود گھٹنوں کے بل جنگ لڑی تھی؟

وہ کون تھا

علی فرہاد حمید

جب سے یہ دنیا بنی ہے پر اسرار حادثات و واقعات کا سلسلہ جاری ہے۔ بعض واقعات تو تاریخ کے اوراق پر سوالیہ نشان بن گئے ہیں۔ انسان جوں جوں ان واقعات کی تہہ میں جانے کی کوشش کرتا ہے اسے اس کے سوا کچھ نہیں ملتا کہ اسرار و رموز کی تہیں گہری ہوتی جاتی ہیں۔ یہ سربستہ راز آج بھی انسانی ذہن کے لئے ایک معمہ بنے ہوئے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کے نائب روڈ ولف ہیس کی طیارے پر جرمنی سے برطانیہ روانگی، اسکاٹ لینڈ میں اس کا گرفتار ہونا دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد اس پر مقدمہ چلنا اور پھر ......۴۵ سال قید کاٹنے کے بعد یہ انکشاف ہونا کہ وہ روڈ ولف ہیس نہیں بلکہ کوئی اور ہے .... ایسے ہی پر اسرار واقعات میں سے ایک ہے۔ جس پر طویل ریسرچ اور درجنوں رپورٹروں کے کھوج لگانے کے باوجود اسرار کا پردہ پڑا رہا ہے۔ آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف

کتابیں اور رپورٹیں دوسری جنگ عظیم کے اس انتہائی اہم اور پر اسرار واقعے کے بارے میں کیا کہتی ہیں۔

روڈولف ہیس ہٹلر کے مشہور زمانہ تھرڈ فوجی ڈویژن کا ڈپٹی تھا۔ وہ نہ صرف ہٹلر کا قابل اعتماد جنرل بھی بلکہ اس کا نائب بھی تھا۔

وہ ۱۸۹۴ء میں اسکندریہ میں پیدا ہوا' جہاں اس کے باپ کا کاروبار تھا۔اس کی زندگی کے ابتدائی چودہ برس مصر میں گزرے۔ وہاں اس نے مقامی جرمن اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ جرمنی واپسی پر اس کے والدین نے اسے گوڈسبرگ کے بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دیا۔ پہلی جنگ عظیم میں اس نے اپنی خدمات انفنٹری رجمنٹ کو رضاکارانہ طور پر پیش کیں۔ ۱۹۱۶ء میں وہ لیفٹیننٹ بن گیا۔ جنگ کے دوران وہ تین بار شدید زخمی ہوا۔ تیسری بار گولی اس کے بائیں پھیپھڑے کو پار کر گئی۔ وہ چار ماہ تک اسپتال میں رہا اور انفنٹری سروس کے قابل نہ رہا۔ لیکن تربیت کے بعد وہ فضائیہ کی ایک یونٹ سے آفس پائلٹ کی حیثیت سے وابستہ ہو گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جرمنی انتشار کی کیفیت میں تھا۔ ہیس نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس کے بائیں جانب گولی نکلنے اور داخل ہونے کا نشان باقی تھا۔اسے سانس کا مرض لاحق ہو گیا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں اسے ایک بار پھر گولی لگی۔اِس دفعہ اس کی بائیں ٹانگ نشانہ بنی۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے میونخ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور گریجویشن سے کمتر درجے کا امتحان پاس کیا۔

اسی سال اس نے نازی پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔ ایڈولف ہٹلر اس کا بانی تھا اور ہیس کا شمار بھی اس کے بانی ارکان میں ہوتا تھا۔

ہیس جلد ہی ہٹلر کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔ وہ اس کا نہایت وفادار ساتھی سمجھا جاتا تھا۔ ایک بار دونوں میونخ کے ایک شراب خانہ میں شراب پی رہے تھے کہ کسی نے غصے میں ہٹلر کے مگ دے مارا' ہیس درمیان میں آگیا اور زخمی ہوا۔ اس واقعے نے ہیس کو ہٹلر کے اور قریب کر دیا۔ نومبر ۱۹۲۳ء میں ہٹلر کی قیادت میں میونخ میں جب بغاوت کی گئی تو ہیس بھی اس کے ساتھ تھا۔ بغاوت ناکام ہوئی اور ہٹلر کو لینڈ برگ کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ ہیس فرار ہو گیا لیکن جب اسے ہٹلر کی گرفتاری کا پتا چلا تو اس نے بھی گرفتاری دے دی۔ ہیس کو بھی ہٹلر کے ساتھ قلعے میں رکھا گیا۔ یہاں اس نے ہٹلر کو اس کی شہرۂ آفاق سوانح حیات لکھنے میں مدد دی جو بعد میں منظر عام پر آئی۔ ۱۹۲۳ء میں ہیس کو مرکزی پارٹی کمیشن کا سربراہ بنایا گیا۔ وہ تمام سیاسی امور کا انچارج تھا۔

۱۹۳۳ء میں جب ہٹلر جرمنی کا چانسلر بنا تو اس نے ہیس کو اپنا نائب بنایا۔ ہٹلر کے بعد اسے جرمنی کا طاقتور ترین انسان سمجھا جانے لگا۔ اسے یہودیوں اور کمیونسٹوں سے سخت نفرت تھی۔ لیکن اس کے نزدیک روس جرمنی کا سب سے بڑا دشمن تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگر برطانیہ سے صلح ہو جائے تو روس سے با آسانی نپٹا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ برطانیہ کی اہم ترین شخصیت ڈیوک اوف ہملٹن کو درون خانہ اعتماد میں لے رہا تھا۔ (برطانیہ کا اہم سیاسی لیڈر)

۱۵ مئی ۱۹۴۱ء..... کا دن ہیس کی زندگی کا اہم ترین دن تھا اس روز اس کی زندگی کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جس پر آج بھی پردہ پڑا ہوا ہے اور کوئی شخص وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد کیا ہوا تاہم واقعات بظاہر یہ بتاتے ہیں۔

۱۵ مئی ۱۹۴۱ء کی سہہ پہر کو ہیس اپنے ملٹری سیکریٹری کے ہمراہ (کارل ہینز (Carl Hans) میونخ میں اپنے گھر سے روانہ ہوا اور ۳۵ میل دور آکسبرگ کے ہوائی اڈے پہنچا۔ وہ پہلے بھی کئی بار یہاں آچکا تھا اور یہاں کا اسٹاف اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ خود بھی ایک تجربہ کار پائلٹ تھا۔ ہیس 110۔D لڑاکا جہاز میں بیٹھا اور تھوڑی ہی دیر بعد اس کا جہاز بادلوں میں گم ہو گیا۔ کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ تاہم جیسا کہ اب بالعموم کہا جا سکتا ہے کہ اسکاٹ لینڈ اس کی منزل تھی جہاں وہ خود ڈیوک اوف ہملٹن سے جرمنی کی صلح کی بات کرنا چاہتا تھا۔

ہیس پونے پانچ بجے ہوائی اڈے سے روانہ ہوا اس کے جہاز میں پیٹرول کی کوئی اضافی ٹینکی نصب نہ تھی۔ یعنی اگر وہ بالکل سیدھ میں پرواز کرتا تو گلاسگو پہنچ سکتا تھا (اسکاٹ لینڈ کا دارالحکومت) جرمن ریڈار نے اس کے جہاز کو ایمسٹرڈیم کے مشرقی ساحل تک پرواز کرتے ہوئے دیکھا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ جہاز گلاسگو کے جنوب میں واقع ایک قصبے ایگل شام میں گر کر تباہ ہو گیا۔ پائلٹ نے پیراشوٹ کے ذریعے کود کر اپنی جان بچالی جسے ایک مقامی کسان نے پکڑ لیا۔ پائلٹ نے پہلے اپنا نام کیپٹن الفریڈ ہارن بتایا مگر بعد میں اس نے کہا کہ وہ ہٹلر کا نائب روڈ ولف ہیس ہے اور ڈیوک اوف ہملٹن سے ملنا چاہتا ہے مگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور اسے قید کر دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جب جرمنی میں نازیوں کے خلاف مقدمہ چلا تو ہیس کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ اسے برلن کے سپانڈرو قید خانے میں رکھا گیا جہاں وہ قیدی نمبر سات کے نام سے مشہور تھا۔

قیدی نمبر سات.......۱۹۷۹ء میں ایک بار پھر دنیا بھر کی خبروں کا موضوع بن گیا جب ایک

برطانوی سرجن نے یہ انکشاف کیا کہ یہ قیدی ہٹلر کا نائب روڈولف ہیس نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ برطانوی سرجن ہگ تھامس نے برٹش ملٹری ہسپتال برلن میں رائل آرمی میڈیکل کور میں خدمات انجام دیتے ہوئے دو مرتبہ روڈولف ہیس کا معائنہ کیا اور یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ روڈولف ہیس کے جسم پر بندوق کی گولیوں سے زخمی ہونے کے کوئی نشانات نہیں ہیں حالانکہ وہ تین مرتبہ شدید زخمی ہوا۔ اس شبہ کے بعد اس نے ہیس کے بارے میں ریسرچ کی اور پانچ سال بعد اس نے دعویٰ کیا کہ قیدی نمبر سات روڈولف ہیس نہیں۔ اس نے اپنے دعوے سے متعلق کئی ٹھوس ثبوت پیش کئے۔ مثلاً ہیس سبزی خور تھا جبکہ یہ قیدی گوشت سمیت ہر چیز شوق سے کھاجاتا ہے۔ ہیس مہذب اور تعلیم یافتہ تھا جبکہ یہ قیدی جانوروں کی طرح کھاتا تھا اور گنواروں کی طرح بات کرتا تھا۔ ہیس ذہنی طور پر چاق و چوبند تھا جب کہ یہ قیدی نفسیاتی مریض تھا ہیس دمے کا مریض تھا اور زیادہ مشقت نہیں کر سکتا تھا جب کہ یہ قیدی مشقت کے دوران دوسروں سے آگے نکل جاتا تھا۔ اس قیدی نے ۲۸ برس تک اپنی بیوی اور اکلوتے بیٹے سے ملنے سے انکار کیا اور جب ملاقات ہوئی تو اس کی بیوی نے کہا کہ اس کا شوہر بالکل بدل گیا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب وہ پیراشوٹ کے ذریعے اسکاٹ لینڈ اترا تو اس کے پاس شناخت کے کوئی کاغذات نہ تھے۔ جب تک وہ برطانیہ میں قید رہا اس کی کوئی تصویر اخبارات میں شائع نہ ہوئی اور نہ ہی برطانوی حکومت نے اس کے جرمنی سے فرار کو پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنا کر اس سے کوئی فائدہ اٹھایا۔ لیکن اگر قیدی نمبر سات روڈولف ہیس نہیں تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ.....

(۱) اصل ہیس کہاں غائب ہوگیا؟ اور پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ جرمنی سے فرار کیوں ہوا؟ جبکہ اس وقت جرمن فوجیں پے درپے فتوحات حاصل کررہی تھیں اور ہٹلر کا ستارہ عروج پر تھا۔

(۲) اگر قیدی نمبر سات ہیس نہیں تھا تو وہ آخر تھا کون؟ اس نے کیوں ۹۳ برس کی عمر تک ہیس کا روپ دھارے رکھا؟ اور اس نے ۴۵ برس تک ناکردہ جرم کی سزا کیوں کاٹی؟

(۳) اس نے اتنی لمبی قید کے دوران یہ کیوں نہ بتایا کہ وہ حقیقتاً" کون ہے جبکہ اس دوران اس کے منصوبہ ساز نازی مجرم بھی مرکھپ گئے پھر بھی وہ خاموش کیوں رہا؟

(۴) ہٹلر کا ایک اور قابل اعتماد جنرل گوئرنگ ہیس سے بری طرح خار کھاتا تھا لیکن نورمبرگ کے مقدمے کے دوران وہ دونوں کیوں آپس میں گپ شپ کرتے رہے۔

ان میں سے بیشتر سوالات آج بھی ایک سربستہ راز ہیں اور قیدی نمبر سات کچھ بتائے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوگیا (اس نے خودکشی کرلی تھی) لیکن ہگ تھامس نے جو سوالات اٹھائے تھے ان کا جواب جرمن فضائیہ کے ایک افسر گولینڈ کی کتاب "دی فرسٹ اینڈ دی لاسٹ" میں ملتا ہے وہ لکھتا ہے۔

"۱۰ مئی ۱۹۴۱ء کی سہ پہر ہٹلر کے جنرل گوئرنگ نے مجھے فون کیا کہ ہیس پاگل ہوگیا ہے وہ برطانیہ پرواز کرنا چاہتا ہے اسے ہر قیمت پر روکنا ہے۔" گولینڈ کے مطابق اس نے چند جہاز فوری طور پر تیار کئے لیکن انہیں یہ نہ بتایا کہ ان کا مشن کیا ہے یہ جہاز کچھ تلاش کرتے رہے جب انہیں کچھ نہ ملا تو وہ تھک ہار کر واپس آگئے۔ یہ تو گولینڈ کا بیان تھا لیکن عام خیال یہی ہے کہ انہوں نے ہیس کے جہاز کا سراغ لگالیا تھا اور اسے مار گرایا جس کے بعد وہ شمالی سمندر میں گر کر دنیا کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہوگیا۔

جہاں تک ہیس کے ڈبل یعنی قیدی نمبر سات کا سوال ہے کہ تو اس بارے میں ہگ تھامس (برطانوی سرجن) کا کہنا ہے کہ اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہٹلر کے ایک اور جنرل ہملر نے تیار کیا تھا۔ ہملر نے دورن خانہ ہٹلر کے خلاف کئی منصوبے تیار کئے تھے وہ ہیس کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہے کیونکہ نازی پارٹی کا اصل دماغ یہی تھا اور ہملر کے منصوبوں کی راہ میں بڑی رکاوٹ بھی تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہیس کو راستے سے ہٹانا تھا تو اور بھی کئی راستے تھے دوسرا اتنے مختصر عرصے میں ہیس کے عزائم کا پتہ چلنا اور اس سے بھی کم عرصے میں اس کا جعلی ڈبل تیار کرنا ممکن نہیں تھا۔ اور پھر اس وقت یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی جب کہ ہٹلر کا ستارہ عروج پر تھا اور اس کے خلاف کوئی منصوبہ کامیاب ہونا بہت مشکل تھا۔

لیکن جو تجزیہ نگار اس بات سے متفق ہیں کہ ہیس کو ہملر اور گوئرنگ نے مروایا ان کا کہنا ہے کہ ہملر کا ہیس کے خلاف سازش تیار کرنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ ہملر کو ہٹلر کے ٹولے میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ہیس کا ملٹری سیکرٹری ہملر کا ایجنٹ تھا۔ اسے علم تھا کہ وہ برطانیہ جانے کا منصوبہ بنارہا ہے۔ ہملر تمام نازی جنرلوں کا محافظ تھا اس نے تمام جنرلوں کے ڈبل تیار کر رکھے تھے جو ان سے بالکل مشابہت رکھتے تھے۔ اسے علم تھا کہ ہیس نے کس وقت برطانیہ روانہ ہونا ہے۔ چنانچہ جونہی ہیس کا جہاز روانہ ہوا ہملر اور گوئرنگ کے جہازوں نے اسے مار گرایا اور ہیس کبھی اسکاٹ لینڈ پہنچ ہی نہیں سکا۔ اور جوناتھن نامی شخص (بعد میں قیدی نمبر ۷) جو

ہیس کے مشابہ تھا وہ ناروے سے ایک اور طیارے میں سوار ہوا اور اس نے اسکاٹ لینڈ میں پیراشوٹ کے ذریعے اتر کر ہیس کی جگہ لے لی۔

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہیس سمندر میں گر کر مرگیا تھا تو ہملر کو اس کا ڈبل برطانیہ بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس بارے میں مبصرین اور ماہرین یہ کہتے ہیں کہ ہملر بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر لوگوں کے اس یقین کو طول دینا چاہتا تھا کہ ہیس مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ اس کے خیال میں یہ ہٹلر کے لئے نقصان دہ تھا۔

بہرحال ..... محققین نے اگرچہ تمام سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن بعض سوالات آج بھی جواب طلب ہیں۔ مثلاً جب اس منصوبے کے اصل خالق ہملر نے نورمبرگ میں نازیوں پر مقدمے کی سماعت کے دوران خود کشی کرلی تو جعلی ہیس نے یہ کیوں نہ بتایا کہ وہ اصل میں کون ہے اور اسے کس نے اور کیوں بھیجا ہے۔ وہ سیاسی پناہ بھی حاصل کرسکتا تھا۔ اس ضمن میں ہگ تھامس (برطانوی سرجن) نے یہ توجیہہ پیش کی کہ ہملر نے اپنے ایجنٹوں کے لئے دھوکا دہی کی سزا موت رکھی تھی بلکہ دھوکے بازوں کے خاندان کو بھی مٹادیا جاتا تھا اور قیدی نمبر سات (جعلی ہیس) پر بھی یہی خوف مرتے دم تک سوار رہا کہ اگر اس نے حقیقت بیان کردی تو بچے کھچے نازی اس کے گھرانے کو مٹاڈالیں گے۔ اس کے علاوہ بھی اس کی خاموشی کی کئی اور وجوہ بھی ہوسکتی ہیں جن سے شاید کبھی پردہ نہ اٹھ سکے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ اگر ہیس اپنی منزل تک پہنچ جاتا تو دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے دنیا محفوظ رہ جاتی۔ کیونکہ ہٹلر کی پالیسیوں میں ہیس کا بنیادی ہاتھ ہوتا تھا۔

اگست ۸۷ء کے دوسرے ہفتے میں' جبکہ قیدی نمبر ۷ کی قید کو ۴۶ برس ہوگئے تھے اور اس کی عمر ۹۳ برس تھی' اس کی لاش جیل کے باغ کے پویلین میں کرسی پر پڑی پائی گئی۔ اس نے گردن کے گرد تار لپیٹ کر اسے کھڑکی کے ہینڈل سے باندھا جب کرسی ایک طرف ہوئی تو اس پھندے نے اسے موت کی نیند سلادیا۔ لیکن یہ واضح نہ ہوسکا کہ اس نے خود کشی کی یا اسے قتل کیا گیا۔ ۹۳ برس کی عمر میں وہ اتنا نحیف اور کمزور تھا کہ خود کشی والی بات حلق سے نہیں اترتی۔ آخری روز اسے کئی سالوں کے بعد ایک ملاقاتی ملنے آیا۔ لیکن اس کا بھی کوئی پتا نہ چل سکا کہ وہ کون تھا اور کب قیدی نمبر ۷ سے مل کر رخصت ہوا۔ خیال یہی ہے کہ اگر قیدی نمبر ۷ کو قتل کیا گیا تو اس میں اسی کا ہاتھ تھا قیدی نمبر ۷ کی موت کا سرکاری طور پر اعلان ۱۷ اگست ۱۹۸۷ء کو کیا گیا۔ تاریخ کا ایک سنسنی خیز راز وہ اپنے سینے میں ہی لئے دنیا سے رخصت ہوگیا۔

زوار حسین بجاونی

ایٹم یونانی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں وہ چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ جسے مزید مختصر نہ کیا جاسکے۔ یہ اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہے کہ یہ خالی آنکھ سے تو کیا، طاقتور سے طاقتور دوربین سے بھی نظر نہیں آسکتا۔ اس کے چھوٹے ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ہم ایک کروڑ ایٹم سیدھی لائن میں برابر ایک دوسرے کے بالکل قریب رکھ دیں تو یہ لائن صرف ایک انچ لمبی ہوگی۔

دنیا کی ہر چیز ایٹموں سے بنی ہے۔ دھاتیں جن سے ہم مختلف کام لیتے ہیں یہ بھی ایٹموں سے بنی ہوتی ہیں۔ ایٹم آپس میں مل کر مالیکیول بناتے ہیں۔ مالیکیول ایک دوسرے کے بالکل قریب ہوتے ہیں۔ یہ ہوا جو ہم سانس کے لئے استعمال کرتے ہیں یہ بھی ایٹموں پر مشتمل ہوتی ہے۔ پانی وغیرہ غرض سب کچھ ایٹموں کا

مرکب ہیں۔ سائنس دان ایٹم سے تو بہت دنوں سے واقف تھے لیکن اس میں چھپی ہوئی بے پناہ طاقت کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔ عرصہ تک وہ یہی سمجھتے رہے کہ اسے مزید مختصر نہیں کیا جاسکتا۔ آخر کار مسلسل تجربوں اور کوششوں کے بعد وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ ایٹم کے دو حصے ہیں۔

برقیہ اور مرکزہ۔

مرکزہ ٹھوس چیز ہوتا ہے جس کے باہر الیکٹران برقیے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ جیسے چاند زمین کے اور زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔ ان سائنس دانوں نے یہ بھی معلوم کیا کہ اگر کسی طرح ایٹم کو توڑ دیا جائے تو اس سے اتنی زبردست طاقت حاصل ہوگی جس سے پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہٹایا جاسکے۔ ۱۹۳۳ میں ہٹلر جرمنی کا فرماں روا بنا تو اس نے جرمن سائنس دانوں کو ایٹم بم بنانے کا حکم دیا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جرمنی نے یورپ پر حملہ کردیا۔ جس سے دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں ایک طرف جرمنی، جاپان اور اٹلی اتحادی اور دوسری طرف برطانیہ، فرانس، روس اور امریکہ متحد تھے۔ یورپ کے بہت سے سائنس دان جرمنوں کے خوف سے امریکہ بھاگ گئے۔ اٹلی سے ڈاکٹر فرنی، ہنگری سے پروفیسر زی لارڈ اور پروفیسر نیل بوہر، سویڈن سے فرار ہوکر امریکہ بھاگ گئے۔ مشہور زمانہ سائنس دان عظیم آئن سٹائن پہلے ہی امریکہ جا چکا تھا۔ جب امریکہ کے صدر کو یہ خبر ملی کہ جرمنی ایٹم بم بنانے کے چکر میں ہے تو اس نے فوراً" ہی یورپ اور امریکہ کے سائنس دانوں کی کانفرنس بلائی اور انہیں جلد از جلد ایٹم بم تیار کرنے کو کہا۔ آخر جولائی ۱۹۴۵ء میں امریکی سائنس دانوں نے کافی تگ و دو کے بعد ایٹم بم کا پہلا تجربہ کیا جو بہت کامیاب رہا مگر جرمنی اس سے پہلے ہی ۷ مئی ۱۹۴۵ء کو ہتھیار ڈال چکا تھا۔ اس لئے جرمنی پر ایٹم بم گرانے کی نوبت نہ آئی۔ البتہ جرمنی کا اتحادی جاپان برابر میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔ اور میدان سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ آخر کار امریکا کے صدر "ٹرومین" نے جاپان کو الٹی میٹم دیا کہ فوراً" جنگ بند کردے ورنہ اس پر ایسی آسمانی بلا نازل ہوگی جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا۔ جاپانیوں نے اس الٹی میٹم کو مذاق سمجھ کر ٹھکرادیا۔ اس پر امریکہ نے ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کے ایک شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا۔ اس وقت اس شہر کی آبادی ۴ لاکھ ۳۱ ہزار ۳۳۶ تھی۔ اس حملے میں ایک لاکھ ۳۰ ہزار آدمی

چین کا بوڑھا درخت سب سے زیادہ پھل دیتا ہے

چین کے مغربی صوبہ جہانگیری میں ایک چودہ سو سال پرانا درخت ہے جس پر ساڑھے بارہ سو کلو گرام (تقریباً" ایک ٹن) پھل اگتا ہے۔ اس بوڑھے درخت کی اونچائی ۳۰ میٹر اور اور پھیلاؤ ۷.۵ میٹر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ درخت کسی پادری نے ۱۴ سو سال قبل لگایا تھا۔ چین میں اس طرح کے چنگکو درختوں کی بہت زیادہ نگہداشت کی جاتی ہے۔

مرسلہ : شاہد الرحمٰن چوہدری، سرگودھا

موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اور باقی ہمیشہ کے لئے اپاہج اور معذور بن گئے۔ تقریباً" تمام شہر ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ اس پر بھی جاپان نہ مانا تو ۹ اگست کو اس کے دوسرے شہر ناگاساکی پر ایٹم بم گرایا گیا۔ اور اس کا بھی وہی حشر ہوا جو ہیروشیما کا ہوا تھا۔ اب جاپان کو مجبوراً" ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس واقعے کو بہت عرصہ بیت چکا ہے۔ اب اتنے ہولناک ایٹم بم بن چکے ہیں کہ ان کے سامنے ہیروشیما پر گرائے جانے والا ایٹم بم پٹاخے کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا میں پانچ ملکوں کے پاس ایٹم بم کے ذخیرے ہیں اور وہ ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ ممالک، امریکہ، روس، فرانس، برطانیہ اور چین ہیں۔ اکیلے روس اور امریکہ کے پاس اتنے بم ہیں کہ ان سے ساری دنیا بھک سے اڑ سکتی ہیں۔ پاکستان بھارت اور اسرائیل نے بھی ایٹم بم کے تجربے کئے ہیں۔ اور اگر یہی حالت رہی تو دنیا کے تمام ملکوں کے پاس ایٹم بم ہو جائیں گے۔

تو پھر اس دنیا کا اللہ ہی حافظ۔

ایٹم سے صرف بم نہیں بنتے اسے انسان کی بھلائی کے کاموں میں بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کی طاقت سے برف سے ڈھکے ہوئے سمندروں کو صاف کیا جا رہا ہے۔ پہاڑوں میں سرنگیں بنائی جا سکتی ہیں۔ بحری جہاز چلائے جا رہے ہیں۔ اور بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ کراچی میں ۱۹۷۲ء سے ایٹمی طاقت سے چلنے والا بجلی گھر کام کر رہا ہے۔

امید ہے کہ ملک میں دوسرے مقامات پر بھی اس قسم کے بجلی گھر جلد ہی قائم ہو جائیں گے۔ اگر ایٹم کی طاقت کو تباہی و بربادی کے بجائے، مفید کاموں کے لئے استعمال میں لایا جائے تو ہماری دنیا گل و گلزار بن سکتی ہے۔

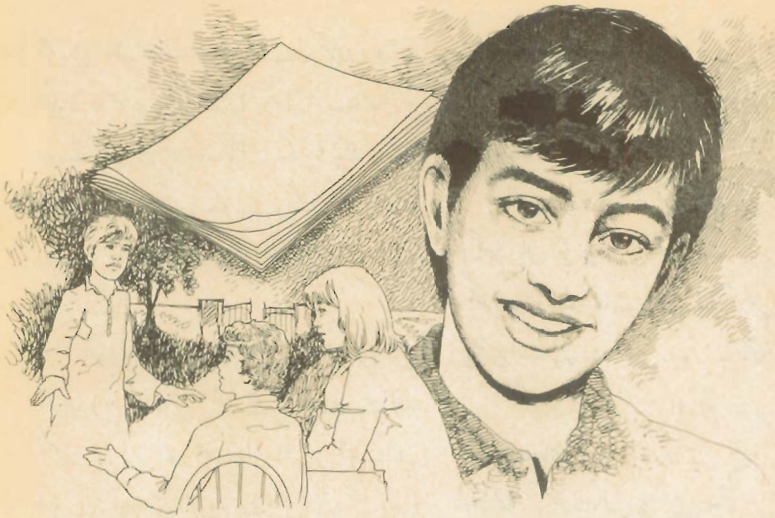

ریہرسل

خالد یوسف انصاری

حمیرا اور قاسم دونوں بھائی بہن بہت خوش تھے۔ ان کے پاپا نے بتایا تھا کہ آج حماد آرہا ہے۔ حماد' قاسم کے پاپا کے دوست کا بیٹا تھا۔ اس کے پاپا پہلے ہائی کورٹ کے جج تھے دونوں گھرانوں کے مراسم ایسے ہی تھے جیسے وہ ایک ہی خاندان کے ہوں۔ حمیرا' قاسم اور حماد میں بڑی گہری دوستی تھی وہ تینوں ایک ساتھ کھیلتے اور پڑھتے تھے۔ تین سال قبل جج صاحب کا تبادلہ کراچی سے لاہور ہوگیا تھا۔ اس وقت کا گیا ہوا حماد آج آرہا تھا۔

حماد کو اپنے ڈیڈی کے ساتھ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے آجانا چاہیئے تھا۔ ٹرین تو ٹھیک وقت پر آگئی لیکن وہ لوگ نہ آئے۔

دونوں بہن بھائی اداس ہوگئے تھے۔ ان کے پاپا بھی کسی قدر سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"کوئی خاص بات ہوگی ورنہ وہ لوگ ضرور آتے" انہوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا "کیوں ڈرائیور۔ تم نے پلیٹ فارم پر اچھی طرح دیکھا تھا؟" انہوں نے ڈرائیور سے پوچھا

"ہاں صاحب! مجھے یقین ہے کہ جج صاحب اس ٹرین سے تشریف نہیں لائے .... میں نے اچھی طرح دیکھا تھا" ڈرائیور نے گاڑی تیز کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تب پاپا!" حمیرا روہانسی ہو کر بولی ، "میں نے اتنے اچھے اچھے کھانے پکوائے تھے"۔ "اور میں نے

بھی پاپا' بنگلہ صاف کروایا تھا ..... کمروں کو اتنا سجایا۔" قاسم نے بھی منہ بنا کر کہا "ارے بھائی تو روتے کیوں ہو تم لوگ۔" ان کے پاپا ہنستے ہوئے بولے ، "آجائیں گے ..... مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ ساڑھے آٹھ بجے والی ٹرین سے ضرور آئیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد قاسم اور حمیرا لان میں کرسیوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ چھ بج چکے تھے۔ حماد کے نہ آنے پر غصہ بھی تھا اور افسوس بھی۔ شاید اسی لئے کھانا بھی انہوں نے ابھی تک نہیں کھایا تھا۔

"آپی! حماد نہیں آئے گا۔" قاسم مایوسی سے بولا۔

"مگر پاپا کہہ رہے تھے وہ ضرور آئے گا ..... اس کے ڈیڈی نے ٹیلی گرام جو بھیجا ہے۔" حمیرا کو اب بھی امید تھی۔

چڑیوں کی چہچہاہٹ دھیمی ہو چلی تھی اور گرمیوں کی شام اداس ہوتی چلی جارہی تھی۔ حمیرا اٹھ کر کیاری کی طرف چلی گئی لیکن پھولوں سے بھرے ہوئے گملے بھی اس کا جی نہ بہلا سکے۔ قاسم نے دل بہلانے کے لئے رسالہ اٹھا کر پڑھنا شروع کیا تھا اور جب اس میں ایک کہانی بھی ایسی نہ ملی جس میں کسی لڑکے کا دوست نہیں آیا تھا تو اس نے اداسی سے رسالہ میز پر رکھ دیا۔ اتنے میں حمیرا بوکھلائی ہوئی آئی : "قاسم کوئی آیا ہے۔"

اس نے ہانپتے ہوئے کہا

"کون .....؟" قاسم سٹپٹا کر کھڑا ہو گیا

"یہ ..... بھ..... بھوت۔"

"ہیں .....!" قاسم نے کیاری سے باہر دیکھا وہاں سچ مچ کوئی آرہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے ..... اس کے جسم پر میلے اور پھٹے پرانے کپڑے دکھائی دے رہے تھے۔

"مگر یہ بھوت نہیں ہو سکتا ....." قاسم نے ہمت باندھی ، "ڈرو نہیں آپی ..... پاپا نے کہا تھا ..... بھوت کوئی چیز نہیں ہوتا ....." حالانکہ قاسم خود بھی ڈر سے کانپ رہا تھا۔

"کیا میں آسکتا ہوں .....؟" آنے والے نے آواز دی۔

"ہاں ..... نہیں ..... تو ..... تم بھوت ....." گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ قاسم کے منہ سے صحیح الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ "نہیں میں بھوت نہیں ہوں ..... بھوت ہوتا تو کہے بغیر چلا آتا۔" وہ دور کھڑا کہہ رہا تھا

"ہاں ..... اگر تم بھوت نہیں ہو تو ..... تو ..... آسکتے ہو!" قاسم نے ڈرتے ہوئے کہا حمیرا نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تھا۔ گندے اور پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے قاسم سے بھی چھوٹا لڑکا جو شکل سے ہی غریب معلوم ہوتا تھا' سامنے آکر کھڑا ہو گیا : "تم ..... کک ..... کون

ہو.....؟" قاسم نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"گھبرایئے نہیں! میں بھوت نہیں ہوں، میں ایک غریب لڑکا ہوں ..... یہاں اس لئے آیا ہوں کہ آپ لوگ میری کچھ مدد کریں، لیکن۔" وہ ایک لمحے کو رکا..... "لیکن آپ لوگ ڈر رہے ہیں ..... آپ کی بہن نے اپنا چہرہ چھپالیا ہے..... شاید اللہ تعالیٰ نے میری صورت اتنی خراب بنائی ہے کہ لوگ مجھے دیکھ کر ڈرتے ہیں۔" ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رو دے گا۔

"نہیں، نہیں تمہاری شکل خراب نہیں ہے ..... ادھر آجاؤ۔" قاسم نے ٹیبل لیمپ کا شیڈ اس طرح کردیا کہ اس کی شکل بخوبی دکھائی دے۔ اس کا خوف رفع ہوچکا تھا۔ حمیرا نے دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ چہرے پر سے ہٹالیے۔ اس کی شکل ڈراؤنی نہ تھی۔ وہ بہت ہی غریب لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اب قاسم نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے پوچھا، "کون ہو تم، کیا چاہتے ہو؟"

"اور تمہارا نام کیا ہے.....؟" حمیرا بھی پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"میں ایک غریب لڑکا ہوں اور میرا کوئی نام نہیں ہے ..... کہیں ہم لوگوں کے بھی نام ہوتے ہیں ہم تو بھکاری ہیں۔"

"چچ چچ"! قاسم نے افسوس ظاہر کیا۔ "یہ لو دس روپے اور جاؤ۔" اس نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں سرکار..... ترس کھا کر بھیک تو بہت سے لوگ دیتے ہیں مگر رحم کھا کر انسانی ہمدردی کی بھیک آج تک کسی نے نہ دی۔ میں بھیک اب نہیں لوں گا۔ میں بھی تو آپ ہی کی طرح ایک لڑکا ہوں۔"

"تم ہماری طرح ہو؟ آئینے میں کبھی شکل دیکھی ہے؟" قاسم کو طیش آگیا اور حمیرا غصے سے ہونٹ چباتی ہوئی بولی، "تمہارے پھٹے ہوئے گندے کپڑوں سے بو آرہی ہے۔"

"لیکن میرے جسم سے بو نہیں آتی۔" اس نے احتجاج کیا۔

"اے ..... زبان چلاتا ہے ..... بھکاری کہیں کا۔" یہ کہتے ہوئے حمیرا نے اس کے گال پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آگئے .... وہ بولا۔ "بھکاری پر اتنا ناراض نہیں ہوتے ..... میرا جواب دینا اگر زبان چلانا ہے تو میں چپ ہوجاتا ہوں .... اچھا اللہ آپ کو سلامت رکھے۔" وہ جانے لگا۔

"ٹھہرو....." قاسم نے آواز دی۔

لڑکا مڑا، اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"کیا خفا ہوگئے.....؟ قاسم نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں! ہم بھکاری بھی کبھی خفا ہوتے ہیں....؟"

اس کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ تھی۔

"تو پھر ٹھیک ہے..... بیٹھو نا!" قاسم کے دل میں نجانے کیوں اس کے لئے ہمدردی تھی۔

"آپ امیر لڑکے ہیں ہماری اتنی ہمت کہاں کہ آپ کے برابر بیٹھیں۔"

"تم میرے دوست ہو۔ اب بتاؤ کچھ اپنے بارے میں، ہم تمہاری مدد کریں گے۔ تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟" قاسم نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں؟" بھکاری لڑکے نے میلی قمیض کے دامن سے اپنی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا،

"میرے ماں باپ اتنے غریب نہ تھے کہ مجھے بھیک مانگنا پڑتی..... میرا باپ ایک مل میں مزدور تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میرا لڑکا خوب پڑھے لکھے اور بڑا آدمی بنے۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ میں ہونہار لڑکوں میں یہ امتحان میں فرسٹ آتا تھا اور میری ماں کہتی تھی، بیٹا تو ایک دن ضرور بڑا آدمی بنے گا، لیکن ہم غریبوں کی زندگی میں شاید اچھی باتیں کرنا بھی گناہ ہے۔ ایک دن میں بہت ہی خوش اسکول سے آرہا تھا، کیونکہ میں اسکول میں فرسٹ آیا تھا اس لئے پرنسپل صاحب نے مجھے انعام دیا تھا۔ ماں نے مجھے سینے سے لگایا۔ کتنا خوش تھیں وہ..... کئی بار انہوں نے مجھے پیار کیا لیکن اسی وقت ہمارے گھر میں بربادی کا طوفان امڈ آیا۔ مل کی مشین میں میرے باپ کی ٹانگ کٹ گئی اور پھر وہ چند گھنٹوں کے بعد ہی وفات پا گئے۔"

"فوت ہو گئے؟" قاسم اور حمیرا ایک ساتھ بولے۔

"ہاں!" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز قاسم اور حمیرا کے دل میں اتری جا رہی تھی۔ "اب زندگی کا کاٹنا مشکل ہو گیا ہے۔" بھکاری لڑکے نے کہا، "میری پڑھائی چھوٹ گئی اور جب کہیں کام بھی نہ ملا تو میری ماں نے بھیک مانگنا شروع کر دی۔ کبھی بھیک مل جاتی اور کبھی نہ ملتی تو ہم بھوکے ہی رہتے۔ سردی کے دن تھے ایک روز جب میں اور میری ماں ایک فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے۔ مجھے سردی لگ رہی تھی ایک آدمی وہاں سے گزرتے ہوئے سگریٹ جلانے کے لئے رکا شام ہو گئی تھی اور اس دن بھیک بھی نہ ملی تھی۔ میری ماں نے بڑی امیدوں کے ساتھ اس کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ بھوک اور ماں نے کتنی التجا اور فریاد کی بس وہ اتنا ہی کہہ پائی تھیں، "اس معصوم بچے پر رحم کیجئے صبح سے بھوکا ہے۔" اس کمینے آدمی نے میری ماں کا ہاتھ اپنے پاؤں تلے کچل دیا۔ وہ چیخ پڑیں ان کا ہاتھ خون سے بھر گیا تھا اور وہ آدمی بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ "عجیب بڑھیا ہے سردی میں بھی یہ لوگ چین نہیں لینے دیتے۔ جیسے سردی صرف انہیں ہی لگتی ہے۔"

قاسم نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے تھے اور حمیرا

کی آنکھوں سے خود بخود آنسو نکل آئے تھے۔ بھکاری لڑکا روتی، سسکتی آواز میں کہہ رہا تھا،

"سڑک کے کنارے میری ماں بے ہوش پڑی تھی اور درد کی شدت سے کراہ رہی تھی تب مجھے معلوم ہوا کہ ماں کی گود میں مجھے سردی کیوں نہیں لگ رہی تھی انہیں بہت تیز بخار تھا پھر ایک شریف آدمی نے میری ماں کو ہسپتال پہنچایا لیکن نہ جانے کون سی چوٹ تھی جس کی وجہ سے ان کے سارے جسم میں زہر پھیل گیا میری ماں چند دن کے بعد مرگئیں۔ اب اتنی بڑی دنیا میں اکیلا ہوں، ایک یتیم اور بے سہارا لڑکا مگر میں تم سے پوچھتا ہوں دوست کہ ہم میں اور تم میں کیا فرق ہے، صرف یہی نا کہ تم اپنی امی کے شہزادے ہو تو میں بھی اپنی ماں کا دل کا ٹکڑا تھا خدا نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور مجھے بھی... تم بڑے آدمی ہو میں بڑا آدمی بننا چاہتا تھا۔ تمہارے ممی پاپا موجود ہیں جو تمہیں پڑھا سکتے ہیں میرے ماں باپ مرگئے ہیں ورنہ میں بھی پڑھتا....."

بھکاری لڑکے کی سسکیاں آنسوؤں کے روپ میں اس کی آنکھوں سے بہہ نکلیں اس نے روتے ہوئے کہا :

"میں آپ سے ہمدردی کی بھیک مانگتا ہوں مجھے نوکر رکھ لیجئے۔ میں نوکری کر کے پڑھوں گا میں ماں کے سپنوں اور باپ کے خواب کو ضرور پورا کروں گا..... میں ایک بڑا آدمی بنوں گا تب دیکھوں گا جب کوئی مزدور مشین میں کٹ کر مرجاتا ہے تو اس کے خون کی مزدوری کیوں نہیں دی جاتی کوئی ماں جب خدا کا نام لے کر بھیک کے لئے ہاتھ پھیلاتی ہے تو وہ کیوں کچل دی جاتی ہے ..... کسی کو کیا حق ہے کہ وہ صحیح بات کرنے والے کو طمانچہ مارے؟" حمیرا نے کچھ کہنا چاہا لیکن سسکیوں میں اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی اس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے وہ اپنا چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی قاسم بھی ضبط نہ کرسکا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ لڑکے کی ڈوبتی ہوئی آواز پھر ابھری،

"دنیا نے مجھے تماشا بنالیا ہے جس کا جی چاہا کتے کی طرح دھتکار دیا..... جس کے جی میں آیا مار لیا..... ابھی میں کمزور ہوں اور غریب بھی لیکن میں اتنا ہی چھوٹا نہیں رہوں گا.... لیکن شاید میں بڑا بھی نہ ہوسکوں کیونکہ ایک بھکاری لڑکے کو لوگ ترقی کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے..... تو میں مرجاؤں گا..... ہاہا..... ہا....." وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

"ہیئر..... ہیئر.... پھر تالیوں کی آوازیں آئیں، سامنے سے قاسم کے پاپا اور جج صاحب آگئے۔ دونوں ہنس رہے تھے قاسم کے پاپا نے بھکاری لڑکے کو گود میں اٹھالیا..... وہ اسی وقت

ہوش میں آگیا وہ مسکرا رہا تھا۔

"ارے تم لوگ ہمیں سلام کہنا بھی بھول گئے۔" جج صاحب نے قاسم اور حمیرا سے کہا۔ لیکن ان کا روتے روتے بُرا حال تھا' منہ سے آواز کیسے نکلتی۔ اب وہ حیرت کے مارے ایک دوسرے کو تک رہے تھے' تب جج صاحب ہنستے ہوئے بولے' "حماد! دیکھو تم نے ان لوگوں کو ڈرا بھی دیا اور رُلایا بھی بہت' اب انہیں مناؤ اور سلام کرو..... یہ تم سے بڑے ہیں۔"

"حمیرا آپی! قاسم بھائی! السلام علیکم!" پھر پھٹے ہوئے کپڑوں کا میک اپ اتار کر وہ بھکاری سے حماد بن گیا۔اس نے رومال سے دونوں کے آنسو پونچھے قاسم اور حمیرا اسے گھور رہے تھے۔

"ڈیڈی کیسا رہے گا ڈرامہ" حماد اپنے ڈیڈی سے چمٹتے ہوئے بولا

"بہت اچھا رہے گا بیٹے..... سچ مچ تم ایک بڑے آرٹسٹ بن جاؤ گے۔" جج صاحب نے اس کی کمر تھپتھپائی۔

"تو یہ ڈرامہ تھا؟" قاسم نے حیرت سے پوچھا۔

"تو یہ حماد ہے؟" حمیرا اسے گھورتے ہوئے بولی

"ہاں اسی سے ملتا جلتا ڈرامہ حماد عنقریب کر رہا ہے۔ حماد کی ضد تھی کہ تم دونوں کو لاعلمی میں رکھ کر اپنے پارٹ کی ریہرسل کرے ہم لوگ جھاڑیوں کی آڑ میں تھے۔ تین سال بعد وہ یہاں آیا ہے اس لئے تم لوگ اسے پہچان نہ سکے۔ پھر وہ پھٹے کپڑے بھی پہنے تھا۔"

قاسم کی ممی بولیں

"اوہ ..... ہم کتنے بیوقوف بن گئے؟" حمیرا اور قاسم بولے پھر تینوں خوب گلے ملے ..... حماد کی تعریفیں ہو رہی تھی۔ سب کے مسرت بھرے قہقہے گونج رہے تھے "بتاؤ گڈو ہم تمہیں کیا انعام دیں .....؟" قاسم کی ممی نے حماد کو پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرا سب سے بڑا انعام تو آپی کا تھپڑ ہے ..... آنٹی!!!"

ایک بار پھر سب کے قہقہے بلند ہوئے۔ حمیرا اداس تھی۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" جج صاحب بولے : "حماد کو خاص طور پر اسی سین پر شک تھا کہ شاید فطری نہ ہو سکے اور اس نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ حمیرا آپا' یا قاسم بھائی نے تھپڑ نہ مارا تب....."

"حمیرا آپی اب تو ہنس دیں ..... ورنہ میں رو دوں گا۔" حماد نے منہ بسورتے ہوئے کہا اور حمیرا ہنس پڑی۔

"اچھا بھئی اب جلدی چلو ..... کھانے کا وقت نکلا جا رہا ہے۔" قاسم کی ممی نے کہا اور سب لوگ لان سے اٹھ گئے۔

قلم دوست

روشنی

محمد سلیم امام، العین

اُمِّ جعفر ایک سخی خاتون گزری ہیں۔ جس راستے سے ان کی سواری گزرتی تھی اس پر بیٹھے دو اندھے صدا لگایا کرتے تھے۔ ایک کی صدا تھی :

"الٰہی مجھے اپنے فضل و کرم سے روزی عنایت کر۔"

دوسرا کہا کرتا :

"اُمِّ جعفر کا بچا ہوا مجھے بھی ملے۔"

اُمِّ جعفر فضل خدا طلب کرنے والے کو دو درہم اور اپنے نام لیوا کو ایک بھُنی ہوئی مُرغی میں دس دینار رکھ کر بھیج دیا کرتیں۔ یہ اندھا اپنی مُرغی دو درہم کے بدلے دوسرے اندھے کے ہاتھ بیچ ڈالتا۔ دس روز تک ایسا ہوتا رہا، گیارہویں روز اُمِّ جعفر اپنے نام لیوا اندھے کے پاس پہنچیں اور کہا :

"تجھے اب تک ہمارا فضل یعنی سو دینار مل چکے ہوں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے تو روز ایک مُرغی ملا کرتی ہے جسے میں اپنے اندھے دوست کے ہاتھ دو درہم میں بیچ ڈالتا ہوں۔"

اُمِّ جعفر نے کہا :

"سچ ہے سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔ اس کا فضل طلب کرنے والا کامیاب اور آدمیوں کے فضل کا طلب گار محروم ہے۔ بے شک صرف اللہ ہی سے مانگنا چاہئے!"

آیئے سچا روزہ رکھیں

صفیہ محبوب

موسم بہار میں جس طرح ہر طرف رنگا رنگ بھینی بھینی خوشبو والے پھول کھل کر اپنی بہار دکھاتے ہیں اسی طرح رمضان میں رحمتوں، برکتوں اور نیکیوں کے انمول پھول کھلتے ہیں۔ سمیٹنے والے انہیں اپنے دامن میں بھر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور لازوال مہربانیوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے بدنصیب بھی ہوتے ہیں جو رمضان ہوتے ہوئے بھی اس مقدس مہینے کی برکتوں اور فضیلت سے محروم رہتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لئے دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ ان کو ہدایت نصیب فرمائے!

رمضان وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں بندہ گناہ گار ہونے کے باوجود اللہ کی رضا کے حصول میں لگ جاتا ہے۔ پورے مہینے وہ اللہ کے احکامات میں جکڑا ہوتا ہے۔ جس کا مزا وہی جانتا ہے۔ کھانے پینے کے مواقع، تنہائی میں سب کچھ میسّر ہے۔ بندہ چاہے تو چھپ کر کھا پی سکتا ہے لیکن اللہ کی رضا مقصود ہے۔ وہ اپنی قوتِ ارادی اور قوت ایمانی سے صبر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جب تک اللہ کی مرضی ہے بندہ کھانے پینے سے رُکا رہا اور جیسے ہی اس کی اجازت ملی اس کی نعمتوں سے

مُستفید ہوا۔ روزہ انسان کے اندر شرافت اور دینداری پیدا کرتا ہے۔ اس مہینے میں ساری دنیا کے مسلمان صابر و شاکر ہونے کے ساتھ ساتھ کشادہ دست اور کشادہ دل ہو جاتے ہیں۔ ان میں رحم دلی، خدا ترسی، دیانت، امانت، اخوت، محبت، مساوات اور فکر و عمل کے پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ غرض کہ یہ مہینہ اخلاقی تربیت کا مہینہ ہے۔ صبر، تحمل، پرہیزگاری، مروّت اور رواداری کا مہینہ ہے۔

روزہ جسمانی بیماریوں کا علاج بھی ہے۔ نفس کے ساتھ ساتھ یہ قلب کی تسکین بھی کرتا ہے۔ انسان بھوکا پیاسا رہے تو اس کو دوسروں کی بھوک اور تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا بیمار نفس صحت یاب ہوتا ہے۔ جسمانی بیماریوں کے علاج سے یہ مراد ہے کہ جسم کا ہر عضو روزے سے ہو۔ آنکھیں بُری چیز نہ دیکھیں، کان بُری بات نہ سنیں، زبان بُری بات نہ کہے۔ ہاتھ غلط کام نہ کریں، پاؤں بُری یا غلط جگہ کے لئے نہ اُٹھیں اور دماغ بُرے خیالات نہ سوچے۔ گندی خواہشات، گالی گلوچ، جھوٹ، غیبت جھگڑے فساد سے روزہ دور رکھتا ہے۔ اس لئے روزے کو مومن کی ڈھال کہا گیا ہے۔

انسانوں کی ہدایت کا نور قرآن مجید اسی بابرکت مہینے میں نازل کیا گیا۔ اس کی طاق راتوں میں اللہ کی رضا کے لئے جاگنا ہزار راتوں سے افضل قرار پایا ہے۔ اس مہینے کی جانے والی نیکیوں کا اجر بھی بے حساب ہے۔ پیارے نبی کریمؐ آقائے دو جہاں فرماتے ہیں :

"آدمی کا ہر اچھا عمل خدا کے حضور کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے۔ ایک نیکی دس سے سات سو گنا بڑھتی ہے لیکن روزے کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ اللہ کا کہنا ہے کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کا جتنا چاہوں بدلہ دوں گا۔"

اللہ ہمیں رمضان المبارک کی برکتیں سمیٹنے اور نیکیاں کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ❁

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ

میں سوچوں میں گُم سمندر کے کنارے کھڑا ڈوبتے سورج کا نظارہ کر رہا تھا ایک مولوی صاحب نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"جوان کیا سوچ رہے ہو؟"

"وہ مصوّر کیسا ہو گا جس نے یہ سینری تخلیق کی ہے" میں نے جواب دیا۔

"تو کیا اس مصوّر کی تعریف نہیں کرو گے؟" مولوی صاحب نے کہا : "مینار سے "آؤ فلاح کی طرف" کی آواز آ رہی تھی اور میں اس آواز کے ساتھ کھنچتا ہوا مصوّر کے گھر میں داخل ہو گیا۔

مرسلہ : محمد عدیل کراچی

ورلڈ کپ کرکٹ

جاوید اقبال کنھوروی، حیدر آباد

پاکستانی کرکٹ ٹیم نے پانچویں ورلڈ کپ کا سیمی فائنل کیا جیتا گویا ہر کسی پر کرکٹ کا بھوت سوار ہوگیا تھا۔ ہمارے ساتھ ورلڈ کپ کرکٹ کے فائنل کے دوران جو واقعات ہوئے وہ یہاں پیشِ خدمت ہیں۔ ہم ویسے ہی کرکٹ سے بیزار تھے کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ اس سے ٹائم کا ضیاع ہوتا ہے اور دھوپ میں سارا دن کھیلنے سے رنگ بھی کالا پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ بقول ہماری امی جان کے میرا بیٹا تو چاند کا ٹکڑا ہے تو ہم امی کی اس بات کی لاج رکھتے ہوئے اس کھیل سے دور ہی رہتے تھے۔

ہاں تو ہم اگلے روز اسکول پہنچے تو اسی روز ورلڈ کپ کا فائنل تھا ماسٹر صاحب کہنے لگے "بچو! میں بورڈ پر چند حساب کے سوال لکھ رہا ہوں جب تک تم یہ سوالات حل کرو اس وقت تک ذرا میں کمنٹری سُن لوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے جلدی جلدی چند سوالات بورڈ پر لکھ دیئے اور پھر خود کمنٹری سُننے لگے۔ حساب کا ایک سوال ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا تو ہم نے ماسٹر صاحب سے کہا "سر! یہ سوال ہماری سمجھ میں نہیں آرہا یہ سمجھادیں۔" یہ سن کر ماسٹر صاحب نے غصّے سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ ورنہ ایک چھکا ماروں گا۔ (یعنی مولا بخش) ابھی ساری لائن لینتھ یاد آجائے گی۔" یہ سُن کر ہم حیرت میں پڑگئے کہ ماسٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔

چھٹی کے بعد ہم گھر پہنچے منہ ہاتھ دھوکر ہم نے کھانا کھایا اور ہوم ورک کرنے بیٹھے لیکن انک پین میں سیاہی ختم ہوگئی ہم نے سیاہی کی دوات تلاش کی لیکن نہیں ملی ہم دوسرے کمرے میں گئے تو بھائی جان ورلڈ کپ کا فائنل ٹی وی پر دیکھ رہے تھے ہم نے ان سے پوچھا "بھائی جان سیاہی کی دوات کہاں رکھی ہے؟؟" بھائی جان جلدی سے بولے : "ہاں میاں داد نے ہی چوکا مارا ہے" یہ سُن کر ہم تلملا اُٹھے ابھی ہم سیاہی کی دوات کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ امی نے

حکم دیا کہ جاؤ خیرو دودھ والے سے دو کلو دودھ لے آؤ یہ سُن کر ہم دودھ والے کی دکان پر پہنچے تو دیکھا کہ خیرو دودھ والا پاکٹ ریڈیو کان سے لگائے ورلڈ کپ کے فائنل میچ کی کمنٹری سُن رہا ہے ہم نے اس سے کہا "جناب! دودھ کیا کلو دے رہے ہو؟؟؟" یہ سُن کر اس نے کہا "ہاں بیٹا دوسو' بارہ روپے" یہ سن کر ہم حیرت میں پڑ گئے اور اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا "جناب ہم نے دودھ من کے حساب سے نہیں بلکہ کلو کے حساب سے لینا ہے۔" یہ سن کر وہ بولے "بیٹا! میں نے دوسو پاکستانی ٹیم کے رنز بتائے ہیں اور بارہ میں نے دودھ کے یعنی بارہ روپے کلو بتائے ہیں۔" یہ سُن کر ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور سمجھ گئے کہ اس پر بھی کرکٹ کا بھوت سوار ہے۔ ہم نے دودھ لیا اور گھر پہنچے گھر پہنچ کر ہم نے اطمینان کا سانس لیا ابھی ہم گھر میں بیٹھے ماہنامہ آنکھ مچولی کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ابو نے کہا "بیٹا! جاؤ اور دوسرے کمرے سے میرے جوتے اُٹھالاؤ۔" یہ سُن کر ہم دوسرے کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ ہماری امی بھی فائنل میچ دیکھنے میں مصروف ہیں ہم نے امی سے کہا "امی جان! ابو کے جوتے کہاں رکھے ہیں؟" یہ سُن کر امی نے بے خیالی میں کہا "بھئی' باؤنڈری پر رکھے ہوں گے۔" یہ سُننا تھا کہ ہم اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ویسے ایک بات ہم بتادیں کرکٹ سے چاہے کتنی ہی بیزاری سہی لیکن ٹیم کے جیتنے کی ہم نے دل سے دُعا کی تھی اب بھی ہماری دُعا ہے کہ پاکستانی ٹیم چھٹا اور ورلڈ کپ ضرور جیتے!!

تاریخ کا بد ترین قحط

انور فراز، پسنی مکران

انسانی تاریخ کا سب سے ہول ناک قحط ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۱ء کے دوران شمالی چین میں پڑا جب ایک تخمینے کے مطابق ۳ کروڑ بھوک سے ستائے انسان قحط کے ہاتھوں دم توڑ گئے تھے۔ چین اس سے پہلے بھی ۱۸۷۶ء سے ۱۸۷۹ء کے دوران زبردست قحط کی زد میں آیا تھا۔ جب ایک کروڑ ۳۰ لاکھ انسانی جانیں لقمۂ اجل بن گئی تھیں۔ برصغیر پاک و ہند کے حوالے سے ۱۹۴۳ء کا مشہور زمانہ قحط آج بھی لوگوں کے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ سر زمینِ بنگال اس قحط کا شکار ہوئی تھی۔ اس دور میں لوگ اس حد تک دانے دانے کو ترس گئے تھے کہ مٹھی بھر چاول کے عوض لوگ اپنے جگر گوشوں کو بیچ دیا کرتے تھے۔ بنگال کے اس قحط نے ایک اندازے کے مطابق ۳۰ لاکھ افراد کی جانیں لی تھیں۔

ہے ”حقیقت“ کچھ

عائشہ عباسی

میں نے رات کا سفر اس لئے چُنا تھا کہ صبح صادق تک پھولوں کی وادی تک پہنچ جاؤں۔ چلتے، چلتے بہت دور جا کر آبادی کے آثار ختم ہوگئے اور سورج نے اپنا سفر مغرب میں ختم کیا، اب میں تنہا راستے پر چلنے لگا کچھ دور تک تو کہیں کوئی بیل گاڑی یا چرواہے اپنے ریوڑ کے ساتھ نظر آتے رہے پھر جنگل شروع ہوگیا میں چلتا رہا کبھی کوئی گلہری کسی درخت کے پیچھے سے منہ نکالتی اور پھر اندر کرلیتی رات کے آٹھ بج چکے تھے اور آسمان پر چاند پورا نکل آیا تھا۔ اس کی روشنی سے پورا جنگل روشن نظر آرہا تھا۔ میں قدم بڑھاتا چلا جارہا تھا کہ اچانک مجھے تیز قدموں کی آواز آئی میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر اچانک ذہن میں خیال کوندا ”بھیڑیے“ قدموں کی آوازیں تیز ہوتی جارہی تھی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کردی میرے پاس ہتھیار نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنے پیچھے دو خوں خوار بھیڑیے دکھائی دیئے۔ ان کی تعداد دو تھی اور ان کی بھوکی نظریں مجھ پر تھیں ان کے کھلے ہوئے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ میں تیزی سے دوڑنے لگا پھر اچانک میری نظر ایک کھنڈر نما مکان پر پڑی یہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا۔ مکان اونچائی پر تھا اور اس پر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ یہ مکان کافی قدیم دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے تیزی سے سیڑھیاں چڑھنی شروع کردیں۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو دروازہ بند پایا۔ بھیڑیے سیڑھیاں چڑھتے

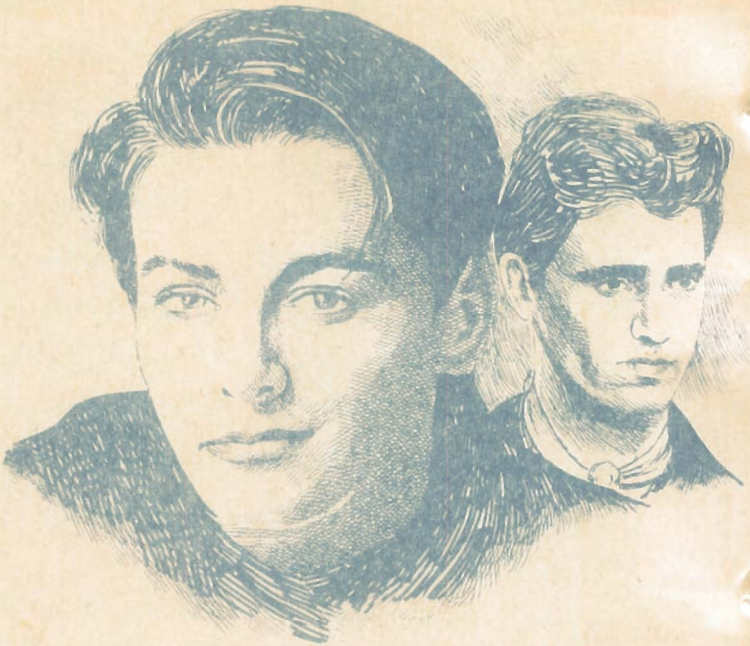

ہوئے قریب آتے جا رہے تھے میں نے دروازے کو دھکا لگایا تو دروازہ کھل گیا اور غیر متوقع طور پر اندر سے ایک شخص نے آکر مجھے اندر کھینچ لیا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے کُنڈی لگا دی پھر شائستہ لہجے میں بولا : "یہ بھیڑیے کسی کو نہیں چھوڑتے آپ کی قسمت اچھی تھی کہ بچ گئے۔" میں حیران و پریشان اس کی طرف دیکھ رہا تھا یہ جنگل بیاباں اور یہ گھر وہ میری اُلجھن سمجھ گیا کہنے لگا۔ "گھبرائیے نہیں..... اندر تشریف لائیے۔ آج رات آپ میرے غریب خانے پر مہمان ہیں صبح انشاء اللہ اپنا سفر شروع کر دیجئے گا۔" میں مکان کے اندر داخل ہوا تو اندر کا حصّہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ فرش پر قالین بچھے تھے اور دیواروں کے ساتھ تکیے لگے ہوئے تھے۔ سنہری تخت بچھا ہوا تھا۔ میرے محسن کا لباس بھی شاہانہ تھا۔ وہ مجھے ایک بڑے سے کمرے میں لے گیا پھر تالی بجائی تو دو زرق برق لباس پہنے خادم نمودار ہوئے۔ "مہمان کا منہ ہاتھ دُھلواؤ اور کھانے پینے کا بندوبست کرو۔" "بہت بہتر سرکار!" انہوں نے مؤدب لہجے میں جواب دیا اور پھر چند ہی منٹ بعد

میں منہ ہاتھ دھو کر کھانے کی میز پر بیٹھا تھا جہاں قسم قسم کے کھانے چُنے تھے۔ گرم گرم پُر تکلّف کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو میری بھوک کو تیز کرنے لگی۔ بھوکا تو میں تھا ہی، کھانوں پر ٹوٹ پڑا۔ کھانا اتنا لذیز تھا کہ دل چاہ رہا تھا کہ بس کھاتا جاؤں اور ہاتھ نہ رُکے۔ خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ پیٹ تو بھر گیا لیکن نیت سیر نہ ہوئی۔

کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا میزبان بہت خوش گو اور مہمان نواز تھا۔ اپنی باتوں سے ہنساتا رہا اور دل خوش کرتا رہا باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ رات کے دو بجے تو احساس ہوا۔ "ارے! دو بج گئے اب آپ آرام کیجئے۔"

اس نے کہا تو مجھے بھی رات کے گزرنے کا احساس ہوا۔ اس نے مجھے سونے کے کمرے میں چھوڑا جہاں نرم نرم بستر میرا انتظار کر رہا تھا۔ بستر نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں خوب سویا اور جب صبح آنکھ کھُلی..... تو پُر تکلّف ناشتہ میرا منتظر تھا۔ کباب، پراٹھے، نہاری..... پتا نہیں اور بھی کیا کیا۔ میں نے خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ کھانے پینے کے بعد.....

..... میں نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا اور واپسی کی اجازت مانگی اس نے بہت خوش مزاجی سے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور بہت سا کھانا بھی ساتھ کر دیا میں نے اپنا سفر پھر شروع کیا۔ اب جنگل میں روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی اور کہیں دور سے مجھے کسی شیر یا چیتے کی دھاڑ سُنائی دے جاتی تھی۔ میں چلتا رہا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے چلنے کے بعد آبادی کے آثار نظر آنے لگے کچھ بیل گاڑی اور چرواہے بھی دکھائی دیئے۔ میں نے ایک چلتے ہوئے چرواہے کو روکا اور پوچھا "بھائی! یہ کون سی بستی ہے؟" "نئے معلوم ہوتے ہو" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں مُسافر ہوں۔" "بھوکے معلوم ہوتے ہو کچھ کھایا پیا تم نے؟" "بندوبست کروں!!" چرواہے کی یہ بات سُن کر میں نے کہا۔ "نہیں نہیں..... میرا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے چند کوس دور واقع ایک مکان میں ایک مہربان شخص نے میری میزبانی کی ہے۔ اس نے نہ صرف بھیڑیوں سے میری جان بچائی بلکہ رات گزارنے کے لئے اپنے گھر کے نرم بچھونے بھی فراہم کئے۔ میں اس کا احسان کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا!!"

"آپ کی میزبانی ایک زندہ شخص نے نہیں بلکہ ایک روح نے کی ہے۔" چرواہے نے میری بات سُننے کے بعد کہا تو میں چونک گیا۔

"روح نے؟ لیکن.....؟؟"

مجھے اُلجھن میں دیکھ کر چرواہا کچھ دیر تک

خلاؤں میں گھورتا رہا پھر وہ بولنے لگا۔ اس کا لہجہ بہت دھیما تھا اور اس کی آواز مجھے دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"صدیوں پہلے اس کھنڈر نما مکان میں ایک شاہی خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان کے لوگ بہت مغرور اور ظالم تھے۔ ایک رات وہ سوئے تو ایسا سوئے کہ انہیں صبح دیکھنی نصیب ہی نہ ہو سکی صرف ان کا ایک پوتا اور دو ملازم باقی بچے۔ شاہی خاندان کا واحد شخص بہت ملنسار، مہمان نواز، بات کا دھنی اور دل کا غنی تھا۔ مسافروں اور مسکینوں کی دل کھول کر مدد کرتا۔ پھر کئی سال گزر گئے۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کے ملازم پہلے ہی مرکھپ گئے تھے ایک دن وہ بھی مر گیا۔ وقت گزرتا گیا تو اس کا مکان کھنڈر ہو گیا۔ لیکن لوگ آج بھی کہتے ہیں کہ شاہی خاندان کے اس رحمدل شخص نے انہیں کھلایا پلایا، ان کی مدد کی۔ وہ اسے زندہ چلتے پھرتے اور باتیں کرتا دیکھتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر چرواہا خاموش ہو گیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور بابو جی! لوگ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں..... نیک لوگ کبھی نہیں مرتے۔"

میں نے اُلجھے ہوئے انداز میں گردن ہلائی پھر اس پوٹلی کو جلدی سے کھول کر دیکھا جس میں کباب، پراٹھے بندھے تھے لیکن یہ کیا.....؟ پوٹلی میں سوائے سُوکھی گھاس کے اور کچھ نہ تھا۔

یہ دیکھ کر چرواہا رونے لگا۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم کیوں رو رہے ہو؟"

اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "یہ ہے دنیا کی حقیقت، باقی رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے!!"

حضورؐ نے فرمایا

☆ قسم کھانے سے مال تو بِک جاتا ہے مگر برکت نہیں رہتی۔

☆ اللہ کو ماننے کے بعد بہترین دانائی انسانوں سے محبت کرنا ہے۔

☆ جو شخص صبر کرنے کی کوشش کرے گا۔ اللہ اسے صبر دے گا۔

مرسلہ : اعجاز فاطمہ، کراچی۔

سنہری باتیں

☆ بہترین اور خوشگوار زندگی یہ ہے کہ گناہ چھوڑ دو۔

☆ جو خدا سے ڈرتا ہے وہ اور کسی سے نہیں ڈرتا۔

☆ جو دوسروں کا دل نہیں توڑتا اس کا بھی دل کوئی نہیں توڑتا۔

مرسلہ : ایم اکرم راجہ، اوکاڑہ کینٹ

منافع کیا ہوتا ہے؟

حافظ محمد اسرار الحق صدیقی

کعب بن عمرہ رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : "منبر کے قریب ہو جاؤ۔" ہم لوگ حاضر ہو گئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر کے پہلے درجہ پر قدم رکھا تو فرمایا "آمین!" جب دوسرے پر قدم رکھا تو پھر فرمایا "آمین" جب تیسرے پر قدم رکھا تو پھر فرمایا "آمین" جب آپ خطبہ سے فارغ ہو کر نیچے اترے تو ہم نے عرض کیا "ہم نے آج آپ سے (منبر پر چڑھتے ہوئے) ایسی بات سنی جو پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔" آپ نے فرمایا "اس وقت جبرئیل علیہ السلام میرے سامنے آئے تھے۔ جب پہلے درجہ پر قدم میں نے رکھا تو انہوں نے کہا کہ ہلاک ہو وہ شخص جس نے رمضان کا مبارک مہینہ پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہوئی۔ میں نے کہا آمین۔ پھر جب میں دوسرے درجے پر چڑھا تو انہوں نے کہا کہ ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے آپ کا ذکر مبارک ہو اور وہ درود نہ بھیجے۔ میں نے کہا آمین۔ جب میں تیسرے درجہ پر چڑھا تو انہوں نے کہا کہ ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے اس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پاویں اور وہ اس کو جنت میں داخل نہ کرائیں۔ میں نے کہا آمین"

اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے فضل سے ان تینوں چیزوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیں اور ان برائیوں سے محفوظ رکھیں۔ ایک اور حدیث پاک میں حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کے قریب ارشاد فرمایا :

"رمضان کا مہینہ آگیا ہے جو بڑی برکت والا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ اس میں تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اپنی رحمت خاص نازل فرماتے ہیں۔ خطاؤں کو معاف فرماتے ہیں۔ دعاؤں کو قبول

کرتے ہیں تمہارے تنافس کو دیکھتے ہیں اور ملائکہ سے فخر کرتے ہیں پس اللہ کو اپنی نیکی دکھلاؤ بدنصیب ہے وہ شخص جو اس مہینے میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم رہ جائے۔"

تنافس اس کو کہتے ہیں کہ دوسرے کی حرص میں کام کیا جائے اور مقابلے پر دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کام کیا جائے۔ پس اے مسلمانوں! یہ مہینہ آپ کو نیکیاں کمانے اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں سمیٹنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حاصل کرنے میں گزر جائے تو یہ کتنی نفع کی بات ہے۔ آج اگر دیکھا جائے تو تقریباً" ہر کوئی دولت حاصل کرنے کی دھن میں' ایک دوسرے سے آگے جانے کی حرص میں لگا ہوا ہے۔ حالانکہ دنیا اور اس کی دولت اور نفع یہیں رہ جانے والی چیزیں ہیں اور فانی چیزیں ہیں۔ آپ کو تو نیکیاں کمانے کی فکر اور دُھن ہونی چاہئے اور یہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے یہ رحمتوں بھرا مہینہ ہمیں عنایت کیا۔ اب اس سے ہمیں فائدہ اٹھانے کی فکر کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق نیک عطا فرمائے۔ آمین

جواہر پارے

- سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ تم کسی پر وہ عیب لگاؤ جو تم میں ہو۔
- خاموشی دل کا سکون ہے اور روح کے لئے وہی درجہ رکھتی ہے جو جسم کے لئے نیند۔
- سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے انسانوں کی سب سے زیادہ خدمت کی ہو۔
- جب ہم کام کرنا چاہتے ہیں تو طاقت خود ہی آجاتی ہے۔
- زندگیوں کی کامیابیوں کا راز ہے کہ پریشانیوں کے باوجود پریشان نہ ہوں۔

مرسلہ : سمیرا معین' کراچی

جواہر پارے

- دُنیا میں ان لوگوں کا نام بلند ہوتا ہے جنہوں نے اپنے اساتذہ کا احترام کیا۔
- خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش رکھو۔
- اچھا دوست حاصل کرنے کے لئے خود اچھے بنو۔
- رشتے داری کے تعلق کو ختم کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔
- زندگی کے ہر قدم پر پھول بکھیرتے جاؤ' ایک دن پورا باغ اگا لوگے۔

مرسلہ : عباس حسین' کراچی

اخبار آنکھ مچولی

دلچسپ خبروں پر مشتمل قلم دوست کا نیا سلسلہ | لعل بخش ، کراچی

جرمنی میں مفت خوروں کی آگئی شامت

جرمنی میں ایک ایسی گاڑی بنائی گئی ہے جس میں کنڈیکٹر نہیں ہوتا۔ اس میں ہر نشست میں ایک چھوٹا سا خانہ ہوتا ہے جس میں مقررہ کرایہ ڈالنے سے اتنے پیسوں کا ٹکٹ نکل آتا ہے اور اگر مسافر اس خانے میں کرایہ نہ ڈالے تو نشست اسے پکڑ لیتی ہے۔ مسافر اگر کرایہ کم ڈالے تو تب بھی اسے نشست پکڑ لیتی ہے۔ جب تک مسافر مطلوبہ کرایہ نہ ڈالے تب تک نشست اسے نہیں چھوڑتی۔

ایک گھڑی میں چوبیس ممالک

سوئٹزرلینڈ میں ایک ایسی دستی گھڑی ایجاد کی گئی ہے جس کے ایک مخصوص بٹن کو دبانے سے دنیا کے چوبیس ملکوں میں سے کسی بھی ملک کا وقت معلوم کیا جاسکتا ہے۔ یہ گھڑی خاص طور پر ان لوگوں کی سہولت کے لئے بنائی گئی ہے۔ جنہیں آئے دن غیر ممالک کے دورے کرنے پڑتے ہیں۔

فقیر فرانس میں ہیں ایسے ایسے

پیرس (فرانس) میں ایک ایسا روزنامہ شائع ہوتا ہے جو صرف فقیروں کے لئے ہے۔ اس کے سارے ایڈیٹر نامی گرامی فقیر ہیں اور اپنے اخباروں میں خبروں کے علاوہ مانگنے کے جدید اور سائنٹیفک اصولوں پر مضمون بھی لکھتے ہیں۔

کرکٹ ڈکشنری

صدف مظفر، راولپنڈی

☆ اب تک دنیا کے ۲۲ کھلاڑی سنچریوں کی سنچری بنا چکے ہیں جن میں ظہیر عباس بھی شامل ہیں۔

☆ جاوید میاں داد پاکستان کے پہلے کھلاڑی ہیں جنہوں نے سو سے زیادہ ٹیسٹ کھیلے۔ پہلے اور سوویں دونوں ٹیسٹوں میں سنچری اسکور کی۔

☆ آسٹریلیا کے مشہور کھلاڑی سرڈان بریڈ مین کا ٹیسٹ کرکٹ میں اوسط سکور 99.99 رنز فی اننگز تھا۔

☆ ایک ٹیسٹ میچ میں 19 وکٹیں لینے کا ریکارڈ جم لیکر کا ہے۔

☆ کرکٹ کے پہلے ورلڈ کپ میں انگلستان کے خلاف گروپ میں میچ بھارت کے سنیل گواسکر سب سے پہلے کھیلنے گئے اور آخر تک آؤٹ نہیں ہوئے لیکن ساٹھ اوور کے اس میچ میں انہوں نے فقط 36 رنز بنائے۔

☆ ویسٹ انڈیز کے کپتان کلائیو لائیڈ نے 74 ٹیسٹ میچوں میں اپنے ملک کی قیادت کی اور 35 مرتبہ ٹاس جیتا جو کہ ریکارڈ ہے۔

☆ سنیل گواسکر نے سرڈان بریڈ مین کا 29 سنچریوں کا ریکارڈ ۱۹۸۳ء میں توڑا۔ انہوں نے کل 34 ٹیسٹ سچریاں اسکور کی تھیں۔

☆ مدثر نذر اور نذر محمد دنیا کے واحد باپ بیٹے ہیں جنہوں نے بھارت کے خلاف کھیلتے ہوئے بیٹ کیری کا اعزاز حاصل کیا۔

مدثر کا اسکور 152 رنز اور نذر محمد کا 124 رنز تھا۔ (ٹیسٹ کرکٹ میں اگر کوئی کھلاڑی سب سے پہلے کھیلنے جائے اور آخر تک آؤٹ نہ ہو تو اسے اصطلاحاً "بیٹ کیری کرنا کہتے ہیں)

☆ کرکٹ کے چاروں ورلڈ کپ مقابلوں میں عمران خان نے 27 وکٹیں حاصل کی ہیں۔

☆ ٹیسٹ کرکٹ میں ایک اننگز کا کم سے کم اسکور 26 رنز ہے جو نیوزی لینڈ نے ۱۹۵۵ میں انگلینڈ کے خلاف بنایا تھا۔

☆ جاوید میانداد ٹیسٹ کرکٹ میں ڈبل سنچری بنانے والے سب سے کم عمر کھلاڑی ہیں۔ یہ کارنامہ انہوں نے 19 سال کی عمر میں انجام دیا۔

☆ مشتاق محمد 17 سال کی عمر میں ٹیسٹ کرکٹ میں سنچری بنانے والے سب سے کم عمر کھلاڑی ہیں۔

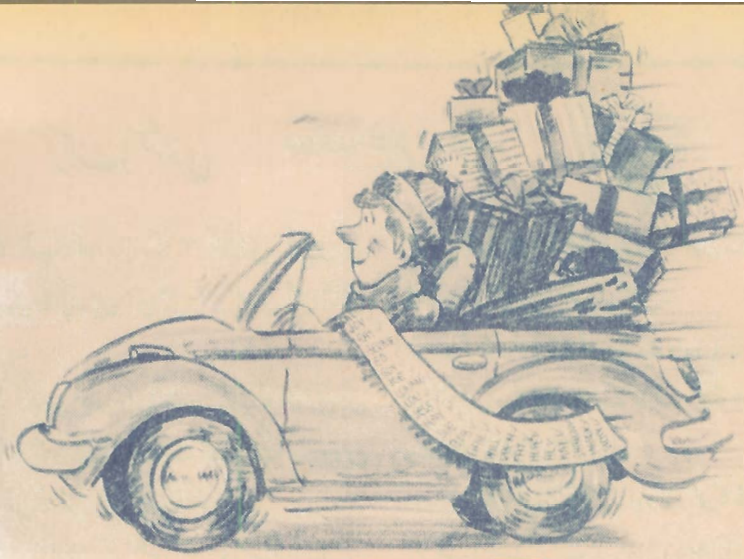

ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

شاعر: صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم انتخاب: مولا بخش

اس موٹر کی شان نرالی
دو سیٹوں، دو پہیوں والی
تین انجن اور ہارن چار
ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

ساتھ ہوا کے اڑتی جائے
دائیں بائیں مڑتی جائے
بڑی ہی سیانی بڑی ہوشیار
ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

اس موٹر کا اللہ بیلی
کوئی نہ ہو تو پھرے اکیلی
گھومے گلی گلی بازار
ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

رنگت اس کی کالی کالی
صورت اس کی بھولی بھالی
قیمت اس کی ساٹھ ہزار
ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

ٹوٹ بٹوٹ کلینر اس کا
ٹوٹ بٹوٹ ڈرائیور اس کا
وہی ہے گاڑی وہی سوار
ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

اک موٹر، اک ٹوٹ بٹوٹ
دونوں برابر کی ہیں چوٹ
ایک سواری ایک سوار
ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

یوں تو ہر دم چپ رہتی ہے
ہارن بجے تو یوں کہتی ہے
دیکھو میں ہوں موٹر کار
ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

ملکۂ امتحان میں

محمد سلیم شہزاد، کراچی

اگرچہ سردیاں اپنا آخری دم بھر رہی تھیں۔ تاہم بہار کی آمد آمد تھی، گویا فروری اپنا آخری روپ دکھا رہی تھی جب کہ مارچ اپنا روپ دھارنے کو تیار تھی۔ یوں سمجھیں کہ میٹرک کے امتحان میں ایک ماہ کے قریب وقت رہ گیا تھا۔ ان لڑکوں کو مسجدوں میں دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ جو سال بھر ویڈیو گیم اور کیرم وغیرہ کی زینت بنے رہتے تھے۔

اور پھر ماہ پلک جھپکتے ختم ہوا اور جب کہ کل پہلا پرچہ تھا تو ہم کافی پُراُمید نظر آرہے تھے کہ اب تو ہم نے تیاری مکمل کرلی ہے۔ اور ایزی فیل کر کے ہم میٹرک سے ادھر ہوں گے، ہم نے یہ تیاری تفہیم نہیں پایا جاتا جس قدر منفی سوچ کے حق میں اس وقت اتحاد ہوا تھا۔ (مجھے اس وقت بے اختیار بصورت۔ "پاکٹ گائیڈ" کے تعاون سے ا گھنٹہ ۱۹ منٹ اور ۳۶ سیکنڈ میں بغیر کسی دباؤ کے مکمل کی تھی۔ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ ہم ایک عدد "اسٹاپ واچ" کے مالک ہیں بلکہ ہم تو وہ قلیل ساوقت آپ اپنے ملک کے سیاست دان یاد آگئے جن کا سبق ہم بھی سیکھ گئے ہیں!!)

خیر صاحب پیپر کا وقت اپنے آخری سانس بھرتا ہوا اختتام پذیر ہوا اور میں بقیہ خالی کاپی "نگران امتحان" کو دیتے ہوئے گھر آگیا۔ پیپر کو حل کرنے کے لئے کی جانے والی "سُپر فلاپ" کاروائیوں کے نتیجے میں ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ "ہم نقل سے پیچھا چھڑا کر محنت کریں گے" اور اس "جہادِ اکبر" میں "خالد بن ولید" کا کردار ادا کریں گے اور یہ کہ ملک کو نقل کی لعنت سے چھٹکارا دلا کر ترقی پذیر سے ترقی یافتہ ملک میں بدل دیں گے۔ آخر کو یہی ہمارا نصب العین ٹھہرا اور اب جب امتحان سر پر آتے ہیں تو ہم پر خوف طاری نہیں ہوتا کیوں کہ ہم نقل جیسی لعنت سے چھٹکارا حاصل کر چکے ہیں ....

آپ کب حاصل کر رہے ہیں ....!!!

مجموعہ شعر پسند

قارئین کے منتخب اشعار

پہچان لیا جاتا ہے اوصاف سے اپنی
خوشبو کا کوئی رنگ نہیں ہوتا فضا میں
مرسلہ : نزہت فیاض خان، کراچی

جن کی آنکھیں تھیں، انہیں بھی کچھ نظر آتا نہ تھا
ایسے اندھے شہر میں ہم کیا بصارت مانگتے
مرسلہ : نہال احمد نہال، کراچی

رات سر پہ ہے پرندو مستقر مت بھولنا
آسمانوں میں اُڑو لیکن شجر مت بھولنا
مرسلہ : مس صبا قادر، کراچی

وقت ایجاب و دعا کا تھا کوئی نعمت مانگتے
سامنے جابر کے سچ کہنے کی جرأت مانگتے
مرسلہ : زرتاشیہ، کراچی

احساس کے انداز بدل جاتے ہیں ورنہ
آنچل بھی اسی تار سے بنتا ہے، کفن بھی
مرسلہ : راؤ اقبال، نوشہرہ

تاریخ نے قوموں کے وہ دور بھی دیکھے ہیں
لمحوں نے خطا کی ہے صدیوں نے سزا پائی
مرسلہ : حافظ عبیداللہ انور، چونیاں

خواہشوں کا بھی کوئی معیار ہوا کرتا ہے
کیسی خواہش ہے کہ مٹھی میں سمندر ہوتا
مرسلہ : محمد عرفان صدیقی، کراچی

حق تنقید ہمیں ہے مگر اس شرط کے ساتھ
جائزہ لیتے رہو اپنے اپنے گریبانوں کا
مرسلہ : پرنس افضل شاہین، بہاولنگر

اک نئی رُت کے سفر پہ جانے والے قافلو
اپنی مٹی، اپنے موسم، اپنے گھر مت بھولنا
مرسلہ : نزہت فیاض خان، کراچی

پھر کیوں ہے غریبوں کے مکانوں میں اندھیرا
اگر یہ چاند سارے زمانے کے لئے ہے
مرسلہ : رانا محمد شاہد، بورے والا

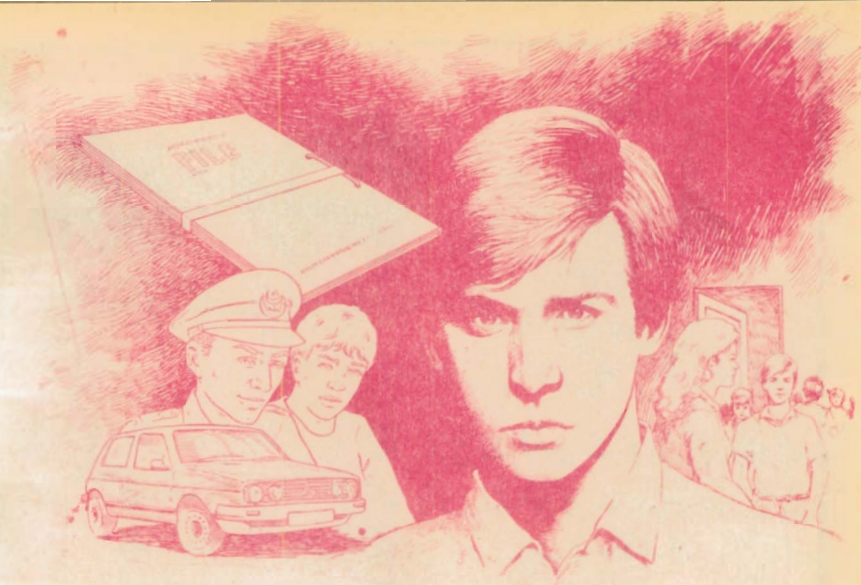

فائل کا سفر

عثمان عدیل، جہلم کینٹ۔

انسپکٹر جمیل نے کاغذات اپنی جیب میں ڈالے اور دراز سے فائل نکال کر میز پر رکھی دی۔ آج وہ ایک کیس کی تفتیشی فائل مکمل کر کے اس پر نظر ثانی کرنے کے لئے بیٹھے تھے۔ فائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد انسپکٹر جمیل اٹھ کھڑے ہوئے اور فائل اٹھالی، ایک نظر اپنے لباس پر ڈالنے کے بعد وہ گھر جانے کے لئے دفتر سے باہر نکل آئے۔ سڑک پر تھوڑی دور تک چلنے کے بعد انہوں نے ایک ٹیکسی روکی اور اسے اپنے گھر کا پتا بتا کر چلنے کو کہا۔ انسپکٹر جمیل اپنے گھر تو خود پہنچ گئے لیکن وہ "فائل" ٹیکسی میں ہی بھول گئے۔

..... ○ ..... ○ .....

"سلیم بڑی خوشی خوشی ایک پارٹی میں شرکت کر کے آرہا تھا۔ اب وہ ایک ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا تاکہ جلد ہی اپنے گھر جا پہنچے۔ اس نے قریب سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روکا اور اس کے اندر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی کی سیٹ پر ایک فائل بھی تھی۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے اس کے متعلق پوچھا لیکن اس نے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ سلیم الدین قریشی نے "فائل" کو الٹ پلٹ کر کے دیکھا لیکن وہ اسے پڑھ نہ سکا کیونکہ وہ ناخواندہ تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے فائل کو ردی میں پھینک دیا۔ اور پھر کچھ دن بعد وہ بھی بھول گیا کہ اسے کوئی فائل ملی بھی تھی۔

ایک دن سلیم کسی دوسرے شہر ایک کام سے گیا ہوا تھا۔ اسی دن اسکی بیوی کی چند سہیلیاں آئیں جن کی خاطر تواضع کے لئے اسے بازار سے چیزیں منگوانی تھیں۔

لیکن اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ پیسوں کا بندوبست کہاں سے کرے کہ اتنے میں اسے ردی خریدنے والے آدمی کی آواز سنائی دی۔ اسے ایک دم خیال آیا کہ کیوں نہ ردی وغیرہ بیچ کر پیسے حاصل کئے جائیں چنانچہ اسے نے ردی والے کو روکا اور اپنے بچوں کی پرانی کاپیاں کتابیں اور کہانیاں ردی والے کے ہاتھوں بیچ ڈالیں۔ اس ردی میں وہ فائل بھی تھی جو اس کے شوہر کو ملی تھی۔

ردی والے نے سارے دن کی اکٹھی کی ہوئی ردی ایک دکان میں دے دی جہاں سے ساری ردی "کاغذ بنانے کے لئے" بڑے شہروں میں بھیج دی جاتی ..... لیکن پرانی کتابیں اور کہانیاں رکھ لی جاتیں کیونکہ اکثر لوگ کتابیں کہانیاں کم قیمت پر لے لیتے تھے۔

"انہی خریداروں میں ایک لڑکا محسن بھی تھا۔ اسے جاسوسی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا اور اکثر اسے یہاں سے "ایسی کہانیاں" مل جایا کرتیں۔ آج بھی وہ اسی کام سے یہاں آیا تھا۔ جب وہ کہانیاں پسند کر رہا تھا تو اسے دوسری جانب ایک فائل پڑی نظر آئی جس پر ایک جیل کا نام لکھا تھا اس نے تجسس میں آکر وہ فائل بھی اٹھالی جو اسے دکاندار نے مفت ہی دے دی۔ اس نے کہانیاں اور فائل سائیکل کے کیریئر میں لگائیں اور ایک دوسری کتابوں والی دکان میں داخل ہو گیا تاکہ وہ اسکول کی کتاب خرید سکے۔ جب وہ دکان سے باہر آیا تو کوئی چور اچکا اس کی سائیکل کے کیریئر سے کہانیاں اور "وہ فائل" نکال کر لے جا چکا تھا۔

وہ اچکا کوئی بڑا شخص نہیں بلکہ ایک بچہ عدنان تھا جسے چھوٹی موٹی چیزیں چرانے کی عادت تھی۔ اسے ان چیزوں کی ضرورت بھی نہ تھی۔ بس اسے مزا آتا تھا۔ وہ چیزیں چرا کر دوستوں میں بانٹ دیا کرتا چنانچہ "وہ فائل" اور کہانیاں اس نے اپنے ایک دوست جنید کو دے دیں۔ جنید انسپکٹر جمیل کا بیٹا تھا..... انسپکٹر جمیل کئی دن سے بے حد پریشان تھے، اس فائل کی گمشدگی کی بنا پر۔ وہ سیدھے اسٹڈی روم میں داخل ہوئے۔ اور پھر ایک کاغذ لے کر میز پر کچھ لکھنے کے لئے بیٹھ گئے۔ لیکن ان سے کچھ لکھا نہ گیا۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اللہ میاں سے دعا کرنے لگے کہ "اے اللہ! میری مشکل آسان فرما۔" پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر میز پر نظریں دوڑائیں تو حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات ان کے چہرے پر نمایاں ہو گئے۔ گمشدہ فائل دو تین جاسوسی کہانیوں کے بیچ پڑی تھی .....!!!

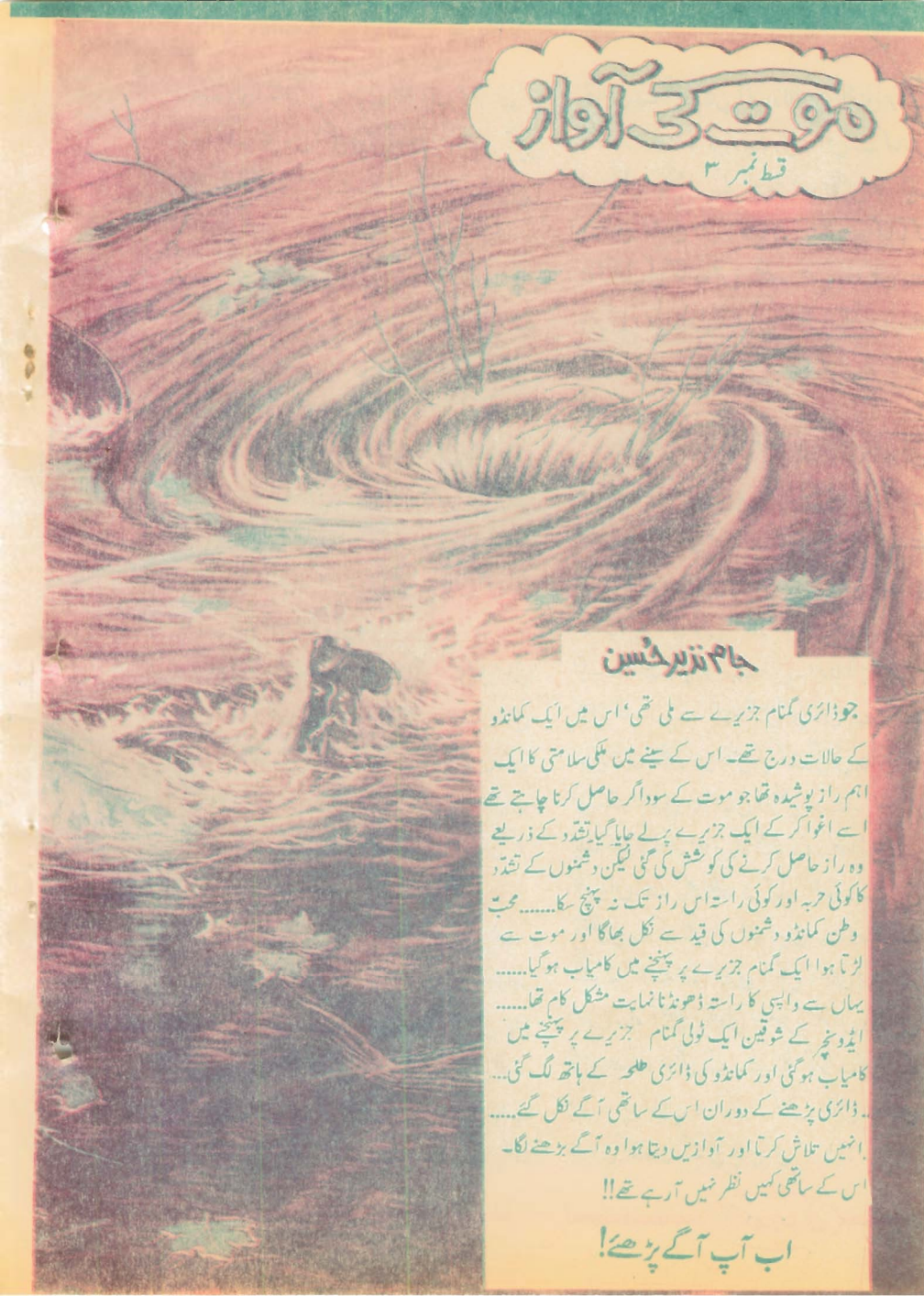

موت کی آواز

قسط نمبر ۳

جام نذیر حسین

جو ڈائری گمنام جزیرے سے ملی تھی، اس میں ایک کمانڈو کے حالات درج تھے۔ اس کے سینے میں ملکی سلامتی کا ایک اہم راز پوشیدہ تھا جو موت کے سوداگر حاصل کرنا چاہتے تھے اسے اغوا کر کے ایک جزیرے پر لے جایا گیا۔ تشدد کے ذریعے وہ راز حاصل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن دشمنوں کے تشدد کا کوئی حربہ اور کوئی راستہ اس راز تک نہ پہنچ سکا..... محبِ وطن کمانڈو دشمنوں کی قید سے نکل بھاگا اور موت سے لڑتا ہوا ایک گمنام جزیرے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا..... یہاں سے واپسی کا راستہ ڈھونڈنا نہایت مشکل کام تھا..... ایڈونچر کے شوقین ایک ٹولی گمنام جزیرے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئی اور کمانڈو کی ڈائری طلحہ کے ہاتھ لگ گئی..... ڈائری پڑھنے کے دوران اس کے ساتھی آگے نکل گئے..... انہیں تلاش کرتا اور آوازیں دیتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے!!

اب آپ آگے پڑھیے!

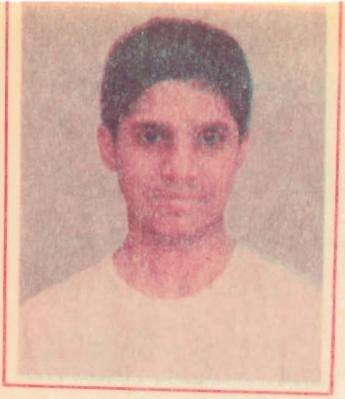

"حیرت ہے یہ لوگ کہاں چلے گئے؟"

طلحہ راہ میں آنے والے جھاڑی نما پودوں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھتے رہا..... وہ کچھ ہی دور پہنچا تھا کہ اسے اپنے ساتھیوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ ان کی باتوں سے پتا لگا کہ انہیں بھی ڈائری کے کچھ اوراق ملے ہیں اور وہ اسی سے متعلق آپس میں باتیں کررہے ہیں۔ سراج کہہ رہا تھا: "اس میں لکھا ہے کہ "یہ جزیرہ ایک معمّہ ہے۔ لگتا ہے ایک بار جو یہاں آگیا وہ پھر واپس اپنی دُنیا میں نہیں جاسکا۔ میں نے کئی بار اس راستے کو تلاش کیا جس کے ذریعے میں یہاں پہنچا تھا لیکن ہزار کوششوں کے باوجود اسے پا نہیں سکا۔ میرا تو خیال ہے یہ جزیرہ کسی نقشے میں بھی نہ ہوگا!! اور اس صفحے پر بھی کچھ لکھا ہے۔" سراج کے خاموش ہوتے ہی نعمان بڑے جوش سے چیخا۔ "کیا لکھا ہے؟" نعمان اور شاہد نے ایک ساتھ پوچھا۔

سراج بولا۔ "لکھا ہے..... یہ جزیرہ جتنا بڑا ہے اتنا ہی پُراسرار بھی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے یہاں کی ہر چیز باتیں کررہی ہو۔ ایک بار میں جنوبی حصے میں گیا۔ میرے ساتھ ایک بندر بھی تھا جو مجھ سے کافی مانوس ہوگیا تھا۔ جب ہم اس حصے

میں پہنچے تو وہاں حد نظر ریت ہی ریت نظر آتی تھی البتہ کہیں کہیں کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ دائیں حصے میں چٹانوں کے بڑے بڑے پتھر اِدھر اُدھر پڑے ہیں..... یہ جنوبی حصہ نہایت پُر اسرار ہے۔ میں نے دور سے دیکھا کہ ریت پانی کی موجوں کی طرح اپنی جگہ سے ہلکورے لے رہی ہے۔ میں نے سانسوں کی آوازیں سُنی ہیں بلکہ اسے میں سانپوں کی طرح پھنکارتا کہوں گا۔ یوں لگتا ہے جیسے یہاں کی زمین سانسیں بھر رہی ہو..... مجھے اچھی طرح یاد ہے بندر میرے کاندھے سے اتر کر ریتیلے حصے کی طرف گیا تھا کچھ دیر بعد مجھے اس کے چیخنے کی آواز سُنائی دی۔ میں اس کی چیخ سُنتے ہی اس طرف دوڑا۔ اسی وقت اس جگہ کی زمین اپنی جگہ سے تڑخنے لگی اور عجیب وغریب غراتی آوازیں آنے لگیں جن میں بندر کی چیخیں گم ہوگئیں۔ کچھ ہی دیر بعد آوازیں آنا بند ہوگئیں اور زمین کا تڑخنا بند ہوگیا۔ میں نے بڑی آہستگی سے قریب جاکر اس جگہ کا تفصیلی جائزہ لیا لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا اور زمین ہموار ہوگئی تھی!!" "آگے پڑھو ناں..... خاموش کیوں ہوگئے؟"

"آگے کا صفحہ پھٹا ہوا ہے۔" سراج کی آواز سُنائی دی۔

"دھت ترے کی!" شاہد کی آواز میں مایوسی کے ساتھ ساتھ تجسّس کا عنصر نمایاں تھا۔ اسی وقت سراج نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

"ارے! یہ ہمارا لیڈر کہاں رہ گیا؟"

"میں یہاں ہوں۔" طلحہ نے چیخ کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ "طلحہ اس جزیرے پر تو بہت ایڈونچر ہے۔" نعمان نے بڑی مسرّت سے جیسے اطلاع فراہم کی۔ "تمہاری ساری باتیں میں نے سُن لی ہیں لیکن اب ایڈونچر سے پہلے ہمیں ایک نہایت اہم کام کرنا ہے ورنہ ہم کبھی بھی اس پراسرار جزیرے سے باہر نہیں جاسکیں گے۔"

طلحہ کی آواز میں جوش کے ساتھ ساتھ ہلکا سا خوف بھی شامل تھا!!

"کیا مطلب؟" سراج، نعمان اور شاہد ایک ساتھ سوالیہ نشان بن گئے

"مطلب یہ کہ جس کمانڈو نے اپنی ڈائری لکھی ہے اس میں صاف صاف درج ہے کہ جو ایک بار اس جزیرے پر آگیا وہ لوٹ کر اپنی دُنیا میں نہ جاسکا۔ میرا تو خیال ہے یہ جزیرہ پانی کے بہاؤ کی وجہ سے راستوں کے نشان تبدیل کردیتا ہے۔"

طلحہ اب اپنے ساتھیوں کے بالکل قریب آگیا تھا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" شاہد حیرت سے بولا۔

"یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی۔" سراج سر کھجا کر

بولا۔

"تمہاری سمجھ میں آئے گی بھی نہیں۔ جوئیں ہیں تمہارے سر میں۔" نعمان نے جھنجھلا کر کہا۔

"ارے تمہارے پاس بھی کچھ صفحات ہیں!!"

شاہد نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ "ان میں کیا لکھا ہے..... کیا یہ اسی کمانڈو کی ڈائری کے اوراق ہیں؟" نعمان اور سراج نے ایک ساتھ پوچھا۔

"ہاں! یہ اسی کمانڈو کی ڈائری کے اوراق ہیں جو اس گمنام جزیرے پر موجود ہے..... لیکن اسے ڈھونڈنے سے پہلے اب ہمیں وہ راستہ تلاش کرنا ہوگا جہاں ہم اپنی کشتی کنارے پر چھوڑ کر آئے ہیں۔"

"لو یہ کون سی مشکل بات ہے۔ ابھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ جہاں ہم نے اپنی کشتی چھوڑی ہے وہاں کنارے پر ناریل کے تین درخت لگے ہیں جو اس راستے کی سب سے آسان پہچان ہے۔" نعمان نے کہا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" طلحہ نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا پھر چاروں دوست پتوں، شاخوں اور جھاڑیوں کو ہٹاتے ہوئے مطلوبہ جگہ پہنچے تو حیرت اور خوف سے ان کی چیخیں نکل گئیں۔

تین درخت کہیں نہیں تھے.... بلکہ چاروں طرف درخت ہی درخت نظر آرہے تھے یا ٹھاٹھیں مارتا نیلا نیلا سمندر!!

"موت کی آواز" ایک نیا موڑ لے رہی ہے۔ مزید دلچسپ اور سنسنی خیز واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے!

اپنی دنیا

آسمانوں سے پوچھ نہ منزل کا راستہ
اپنے سفر میں راہ کے پتھر تلاش کر
ذرّے سے کائنات کی تفسیر پوچھ لے
قطرے کی وسعتوں میں سمندر تلاش کر

مرسلہ : ملیحہ عبدالتین، کراچی

کشکول میں جس روز کوئی بھیک نہ ہوگی
وہ رات مری قوم پہ تاریک نہ ہوگی
اس شہر کی پیشانی پہ لکھی ہے تباہی
جس شہر کے مکتب کی فضا ٹھیک نہ ہوگی

مرسلہ : طیبہ صدف، رحیم یار خان

آخری بات

لوگ اقتدار کے لئے تگ و دو کرتے ہیں جبکہ اقتدار اور غلبہ صرف ان کے لئے ہوتا ہے جس کے لئے اللہ چاہتا ہے۔ سورہ منافقون آیت نمبر آٹھ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ "

ترجمہ: "اور عزت ہے اللہ کے واسطے اور اس کے رسول ﷺ کے لئے اور مومنوں کے لئے لیکن منافقین اس بات کو نہیں جانتے۔"

اللہ تعالیٰ قرآن میں مزید فرماتا ہے:

" وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ "

ترجمہ: "اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔"

بندہ چاہے بھی تو کسی کے دل میں اپنی عزت پیدا نہیں کرا سکتا۔ اور نہ ہی کسی کو رزق دے سکتا ہے۔

عزت، ذلت اور روزی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں سب کچھ اللہ ہی سے مانگنا چاہئے۔

نورس
UQRA
شربت نورس
شربت نورس انتہائی کاوش، جدید ترین مشینری کی مدد اور ماہرین
کی انتھک کوششوں کو یکجا کر کے سائنٹیفک اصولوں کے تحت تکمیل
کو پہنچا ہے۔ نورس کا ذائقہ ہی اس کی خوبی نہیں بلکہ اس کا ایک
ایک گھونٹ مفرح اور صحت بخش ہے۔ اسے دودھ، آئسکریم، کسٹرڈ اور
قلفی میں استعمال کرنے سے لذت دوبالا ہو جاتی ہے اور موسم برسات
میں تازہ لیموں کے ساتھ نورس فریش لائم موسم کے مضر اثرات
سے محفوظ رکھتا ہے۔
نورس
قومی مشروب
احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی 112، نورس روڈ، سائٹ، کراچی 75700
ٹیلکس:
فون نمبر: (5 لائنیں)

REGD No M-266 FEBRUARY 1996
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

Interflow